ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

اگست ۲۰۲۳ء

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

۱۵/روپئے

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ ہاسپٹل میں معمر خاتون کی عیادت کرتے ہوئے۔

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ اپنے دیگر وزراء کے ساتھ جے کے سیمنٹ پلانٹ کا افتتاح کرتے ہوئے۔

جلد:78 شمارہ:04

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

اگست ۲۰۲۳ء

سرپرست

جناب سنجے پرساد

پرنسپل سکریٹری، محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اترپردیش

پبلشر: ششر (ڈائرکٹر، انفارمیشن)

جناب انشُمان ترپاٹھی (ایڈیشنل ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ایڈیٹر

ریحان عباس

رابطہ:9838931772

Email:nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

نظارت: آسیہ خاتون، 9721856191

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِسالانہ:

صباعرفی:7705800953

تزئین کار: ایم. ایچ. ندوی

مطبوعہ: پرکاش پیکچرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اترپردیش

زرِسالانہ: ۱۸۰/روپئے

ترسیل زرکاپتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پنڈت دین دیال اُپادھیائے سوچنا پریسر، پارک روڈ،

اترپردیش، لکھنؤ 226001

Pleas send Cheque/Bank Draft in favour of Director,Information & Public Relations Department,Pandit Deendayal Upadhyay Soochna Parisar,UP,Lucknow

خط وکتابت کاپتہ

ایڈیٹر نیادور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعۂ کوریئر یارجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیادور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، سوچنا بھون، اترپردیش، لکھنؤ 226001

ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

اس شمارے میں...

اداریہ

اپنی بات ۲

مضامین

باپائے قوم مہاتما گاندھی، علامہ اقبال اور تعمیرِ وطن	ڈاکٹر سید عروج احمد	۳
ہندی گورکھپوری کی قومی شاعری	ذاکر حسین ذاکر	۶
1857ء کی جنگ آزادی اور مسلم علماء	ڈاکٹر شاہد احمد	۱۰
تحریک آزادی میں غیر مسلم صحافیوں کی خدمات	ڈاکٹر عبدالسمیع	۱۶
1857: تحریک آزادی؛ اپنوں کی درپردہ سازش کا شکار	عظمت علی	۲۰
اردو شاعری میں حب الوطنی کے عناصر	مبینہ	۲۲

منظومات

غزل	پرویز ادیب	۵
غزل	پروفیسر نوید الیاس گنوری	۹
غزل	جمیل احمد جمیل	۱۵
غزل	عابدہ خاں کہکشاں	۲۱
غزلیں	تجس اعجازی/کوثر پروین	۲۶
غزل	خورشید دلدار نگری	۲۹

افسانے

بازار	احمد صغیر	۲۷
مبارک قدم	حبیب کیفی	۳۰

ترقیات

پانچ کروڑ ضرورت مند سماجی بہبود اسکیموں سے فیضیاب	ہاشمی رضوی	۳۲

ماہنامہ نیادور، information.up.nic.in ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔

قیمت فی شمارہ: پندرہ روپے — سالانہ رکنیت فیس: ایک سوسّی روپے

دوسال کی رکنیت فیس: تین سو ساٹھ روپے

تین سال کی رکنیت فیس: پانچ سو چالیس روپے

نوٹ: اپنی کمپوز شدہ تخلیقات، مندرج ای میل آئی ڈی پر ہی ارسال کریں۔

E:mail:nayadaurmonthly@gmail.com

نیادور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اترپردیش کا متفق ہونا ہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

ماہنامہ نیا دور اگست ۲۰۲۳ء کا شمارہ حاضر ہے۔

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اُتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

حُب الوطنی اور وطن پرستی کا یہی وہ جذبہ ہے جو ہمیں اپنی مٹی سے وفاداری کا سبق سکھاتا ہے۔ ہر سال آزادی کا جشن منانے کا اصل مقصد یہی ہے کہ ہم اپنے ملک اور اس ملک میں بسنے والے تمام لوگوں سے وہ چاہے، جس مذہب اور قوم سے تعلق رکھتے ہیں، انھیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ ہم سب ایک ہیں اور ہم سب کا رشتہ اسی ملک کی مٹی سے ہے، جو ہمیں ذات، پات، بھید بھاؤ، مذہب و مسلک سے بلند ہو کر آزادی کی اس فضا میں کھل کر سانس لینے کا حق دیتا ہے۔

بھارت نے یہ آزادی غلامی کی ایک لمبی لڑائی کے بعد حاصل کی اور ہمارے مجاہدین آزادی نے بخوشی اور ہنستے ہنستے موت کو گلے لگا کر ہمیں یہ آزادی دلائی، عزم و استقلال سے بھرپور اپنے مادر وطن کی ناموس کے تحفظ کے لئے میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے والے جیالوں کے قربانی کے جذبے کو دیکھ انگریزی سامراج کو بھارت چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ لہٰذا آج بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم سب اس بات کا احساس کریں کہ اس آزادی کی قیمت کیا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک پوری دنیا میں ایک مثالی ملک کی حیثیت سے پہچانا جائے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی صف میں کھڑے ہوئے آخری آدمی کو بھی اس کے حق سے محروم نہ ہونے دیا جائے۔ ہمیں خود اپنی اس آزادی کا احترام کرنا ہوگا۔

اس لیے کہ یہ آزادی ہمیں بڑی قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی۔ 1857ء سے سو برس پہلے آزادی کی تحریک چلائی گئی جس کے نتیجے میں بنگال کے سراج الدولہ نے 1757ء میں حیدر علی نے 1767ء میں مجنوں شاہ نے 1776ء سے 1780ء تک اور ٹیپو سلطان 1791ء میں مولوی شریعت اللہ اپنے بیٹے کے ہمراہ 1812ء میں اور سید احمد شہید 1831ء میں انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جنگیں لڑیں۔ ہمارے بھارت کے عظیم سپوتوں نے انگریزی حکومت اور اس کے سامراج کے خلاف تقریباً ڈھائی سو سال تک اپنی آزادی کے لیے لڑے تب کہیں جا کر اس ملک کو آزادی نصیب ہوئی۔

ہم سب اسی لئے ہر سال اپنے ہاتھوں میں ترنگا لے کر اپنے ملک کی حفاظت کے لیے اپنے شہیدوں کے مقدس لہو کی قسم کھاتے ہیں اور ملک کے کونے کونے میں امن و شانتی، چین و سکون، آپسی محبت یکجہتی و بھائی چارہ کا ماحول قایم رکھنے کے لیے ایک نیا عہد لیتے ہیں۔ ملک کی خوشحالی اور ترقی میں اپنے کردار کو ادا کرنے کا احساس کراتے ہیں۔ آیئے ہم یہ عہد کریں کہ ہم محبان وطن جب تک زندہ رہیں گے اپنے ملک کی ترقی و خوشحالی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے اور اس سرزمین کی فضا کو امن و چین اور اخوت و محبت کے خوبصورت جذبوں سے آراستہ کریں گے۔ اس شمارے کے مشمولات کی ترتیب و تدوین آزادیٔ وطن سے عبارت مضامین سے ہی متعلق ہیں، ہمیں امید ہے کہ گزشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی آپ کو ضرور پسند آئے گا۔

دل سے نکلے گی نہ مر کر بھی وطن کی الفت
میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئے گی

ریحان عباس

یہ شمارہ اگست ۲۰۲۳ء کا ہے جس کو نومبر ۲۰۲۴ء میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر سید عروج احمد

اسٹنٹ پروفیسر، ایل بی ایس کالج، سرونج گورنمنٹ، ودیشہ

7049024741

بابائے قوم مہاتما گاندھی، علامہ اقبالؔ اور تعمیر وطن

بابائے قوم مہاتما گاندھی بیسویں صدی کے سب سے عظیم مفکر، فلسفی، صاحب بصیرت سیاسی رہنما، حریت کے حامی، قومی اتحاد کے علمبر دار اور تاریخ ساز شخصیت کے حامل تھے۔ آپ نے وطن عزیز ہندوستان کی تصویر بدلنے کے ساتھ ہی دنیا کے دیگر ملکوں کو بھی غلامی سے آزاد ہونے کا حوصلہ بخشا۔ گاندھی جی کا شمار ان عظیم مفکرین میں ہوتا ہے جو دنیا کے نشیب وفراز کا گہرا مطالعہ کر کے روشن وتابناک مستقبل کے لیے قوم کی رہنمائی کرتے ہیں۔ جس طرح بابائے قوم مذہبی اصولوں کے پابند تھے اسی طرح مادر وطن کے ذرے ذرے سے محبت کا اعلان کرنے والے علامہ اقبال بھی شاعر مشرق کے نام سے مشہور ومقبول ہوئے؛ نیز اپنے فکر وفلسفے سے یہ دونوں عظیم شخصیات ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی نظر آتے ہیں اور ذات پات، مذہب، علاقائیت، رنگ ونسل اور زبان وتہذیب کی بنیاد پر اختلاف کے بجائے قومی یکجہتی کا نظریہ ان کی فکر کا بنیادی پتھر ہے۔ علامہ اقبال پکے محب وطن، مذہبی رواداری کے علمبر دار، اور بلاکسی تعنت وتعصب کے ہندوستانی فلاسفروں، رشی منیوں اور سنتوں کے مدح خواں تھے۔ آپ نے مذہب اسلام سے گہری وابستگی کے باوجود ہندوستانی فکر وفلسفے کا وسیع وعمیق مطالعہ کیا، یہی وجہ ہے کہ وہ کپل، شنکر آچاریہ، بادرائن اور رامانج کے فلسفوں سے متاثر تھے، جس کا عکس ان کے کلام میں مختلف مواقع پر ظاہر ہوتا ہے۔

جذبہ حب الوطنی سے سرشار علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے دور اولین میں چند نظمیں تخلیق کی ہیں؛ جن میں "ہمالہ" کے نام سے لکھی گئی مخصوص نظم کو ان کے اردو کلام کے پہلے مجموعے "بانگ درا" 1934 کی اشاعت میں صفحہ اول پر جگہ ملی۔ اس نظم میں اقبال نے اپنے وطن عزیز کی قدیم تہذیب وثقافت اور اس وادئ کہسار کے قدرتی مناظر کی خوب مدح کی اور ہمالہ کو صرف ایک پہاڑ ہی نہیں، بلکہ ہندوستان کے تحفظ اور سالمیت کا سنتری اور نگہبان مانا ہے: ع

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں — چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
امتحان دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو — پاسباں اپنا ہے تو، دیوار ہندوستاں ہے تو

اسی طرح جب ہم مہاتما گاندھی کے فلسفۂ اہنسا، عدم تشدد، سرو دھرم سمبھاؤ اور "جیو اور جینے دو" کے نظریات کی روشنی میں ان کی آپ بیتی My experience with truth کا بدرجۂ غایت مطالعہ کرتے ہیں تو یقین ہو جاتا ہے کہ انہوں نے دنیا کے قابل ذکر فلسفیوں اور دانشوروں کے افکار ونظریات کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ مہاتما گاندھی ہندوستانی زبان کے زبردست مداح تھے۔ انھوں نے اپنی عوام کو بیدار کرنے اور انگریزوں کے چنگل سے نکال کر تحریک آزادی سے جوڑنے کے لئے اردو رسم الخط میں "ہریجن سیوک" کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار بھی جاری کیا۔ جس کا پہلا شمارہ 5 مئی، 1946 بروز اتوار احمد آباد کے کالوپور میں نوجیون پریس سے جاری ہوا۔ جب تحریک آزادی کی جدوجہد میں بار بار یہ سوال بڑے زور شور سے اٹھا کہ ہماری قومی زبان کیا ہوگی؟ تو بابائے قوم نے اس لسانی تنازعے کے حل کے طور پر قوم کے سامنے ہندی یا اردو کے بجائے "ہندوستانی" زبان تجویز کی؛ جب 1918 میں شہر اندور میں منعقد آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن کے اجلاس کی صدارت کے دوران اپنے ہندوستانی زبان کے عقیدے کو مزید تقویت بخشتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ:

"ہندی سے میری مراد وہ زبان ہے جو کہ شمالی ہندوستان میں رائج ہے جسے ہندو اور مسلمان دونوں ہی مشترکہ طور پر استعمال کرتے ہیں اور جس کو ہندو اور مسلمان دونوں ہی بآسانی سمجھ لیتے ہیں اور جس کی لفظیات بھی مشترکہ ہے۔"1

اس ہندوستانی زبان کی مثال علامہ اقبال کے "ترانۂ ہندی" کی سادہ اور دلکش زبان کے حوالے سے گاندھی جی پیش کرتے ہیں اور اس ترانے کو "ہندوستان کی قومی زبان کا نمونہ" قرار دیتے ہو گاندھی جی فرماتے ہیں کہ:

"کون ایسا ہندوستانی دل ہے، جو اقبال کا "ہندوستان ہمارا" سن کر دھڑکنے نہیں لگتا، اگر کوئی ایسا دل ہے تو میں اسے اس کی بدنصیبی سمجھوں گا۔ اقبال کے اس ترانے کی زبان ہندی یا ہندوستانی ہے۔۔؟ یا اردو۔۔؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہندوستان کی قومی زبان نہیں ہے۔"2

"عاجزانہ انداز سے گاندھی جی کی علامہ اقبال سے عقیدت اور ان کی قیادت و دیانت کا اعتراف عیاں ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ علامہ اپنے ذاتی اعذار کی بنا پر گاندھی جی کی اس تجویز پر لبیک نہ کہہ سکے۔ اسی طرح علامہ اقبال بھی گاندھی جی کی عادات واخلاق، اصول پسندی کے خصائل کے ساتھ تحریک آزادی میں ان کی قربانیوں کے معترف تھے، جن کا ذکر 21 نومبر 1921 کے روزنامہ "زمیندار" میں شائع ہوئی ان کی نظم "گاندھی" میں ذکر کرتے ہوئے اقبال نے مہاتما گاندھی کو "مرد پختہ کار وحق اندیش و باصفا" کہا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ بابائے قوم مہاتما گاندھی اور محب وطن علامہ اقبال دونوں اپنی اپنی قوم کو بیدار کر کے محبت کا جام پلاتے رہے تاکہ وطن عزیز غلامی کی بیڑیوں کو توڑ کر دنیا کے عظیم ملکوں میں اپنا مقام حاصل کر سکے۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کو ملک کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے نہایت ضروری قرار دیا۔"

علامہ اقبال اور مہاتما گاندھی کا پیغام مشترکہ طور پر اس ملک میں بسنے والے مختلف فرقوں اور طبقوں میں آپسی میل ملاپ اور بھائی چارے کو فروغ دینا تھا۔ سرزمین ہند کے تعلق سے اقبال کے جذبات کا مظاہرہ ان کے اسی "نغمۂ عشق" ترانہ ہندی سے ہوتا ہے۔ جو اپنی مادر وطن کے لیے ان کی دیوانہ وار محبت کو لطیف و نازک رنگ و آہنگ میں ظاہر کرتا ہے: ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اس نظم کے متعلق بابائے قوم مہاتما گاندھی نے رسالہ "جوہر" (دہلی) 1938 کے خصوصی شمارہ "اقبال نمبر" کے لیے ایڈیٹر کے نام ایک خط اردو میں خود اپنے ہاتھ سے لکھا اور اس پر اردو میں دستخط کر کے علامہ محترم سے اپنی عقیدت اور اس نظم "ترانۂ ہندی" کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی:

"مورخہ: 9 / جون 1938ء

بھائی محمد حسین،

آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے میں کیا لکھوں؟ لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم "ہندوستاں ہمارا" پڑھی تو میرا دل بھر آیا۔ اور یارودہ جیل میں تو سیکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

آپ کا:

مو۔ک۔ گاندھی" 3

مہاتما گاندھی کے اس خط کے ذریعے اقبال کی نظم ترانہ ہندی کے بارے میں ان کی دلی کیفیت کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے: گویا اقبال کی یہ نظم انھیں تحریک آزادی کی جدو جہد کے لیے روحانی غذا اور توانائی فراہم کرتی تھی، اسی لیے اسے وہ ہمیشہ گنگناتے رہتے۔

اقبال نے رگ وید کی ایک معروف دعا "گایتری منتر" پر مبنی ایک نظم "آفتاب" تخلیق کی جو رسالہ مخزن 1902 میں شائع ہوئی: ع

اے آفتاب روح دوران جہاں ہے تو
شیرازہ بند دفتر کون و مکاں ہے تو

اس نظم کے بارے میں خود علامہ فرماتے ہیں کہ اس کے اشعار خدائے برتر کی عظمت اور بڑائی کو بیان کرتے ہیں، ویدوں میں لفظ "سوتر" کا استعمال سورج کے لیے کیا گیا، جس طرح تصوف کی دنیا میں صوفیائے کرام نے "نور" اور "تجلی" خدا کے لیے استعمال کیے ہیں اسی طرح اردو میں "سوتر" کے متبادل علامہ نے 'آفتاب' کا لفظ استعمال کیا جس کا مطلب نور کا سرچشمہ ہے۔ یہی "گایتری منتر" گاندھی جی کا مذہب، اور عقیدت کا مرکز تھا۔

مہاتما گاندھی نے جس رام کو تا زندگی اپنی عقیدت و محبت کا مرکز بنا کر پوجا اور اپنے آخری وقت میں بھی "ہے رام" کہہ کر یاد کیا، انھی 'رام' کو علامہ نے بھی اپنے کلام میں ایک شاہکار نظم کے ذریعے خراج تحسین پیش کی اور ان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے خوب مدح کی ہے۔ شری رام کی شجاعت، پاکیزہ زندگی، انسانیت سے محبت اور والدین کی فرماں برداری کو علامہ اقبال نے ان الفاظ کا خوبصورت جامہ پہنایا: ع

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

سچے رام بھگت اور راجہ رام چندر جی کے حکومتی نظام کے مداح، گاندھی جی نے مادر وطن کی آزادی کے بعد رام راجیہ کے قیام کا جو خواب دیکھا تھا وہ ان ہی اوصاف کی خاطر تھا جنہیں علامہ اقبال نے اپنی نظم کے ذریعے بیان کیا ہے۔

گاندھی جی کی آپ بیتی کا مطالعہ کرنے سے ہمارے سامنے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ ہر روز صبح "گیتا" کا پاٹھ کرتے اور اس کے ساتھ قرآن مجید اور بائبل کا مطالعہ بھی فرماتے۔ "بھگود گیتا" کے فلسفہ پر بہت مضبوطی اور پابندی کے ساتھ عمل پیرا رہے جس کا اثر تحریک آزادی کی مہمات میں نظر آتا ہے۔

وہیں دوسری طرف بھگوت گیتا کے خالق شری کرشن جی کے فلسفۂ عمل سے متاثر ہو کر علامہ اقبال "گیتا" کے اشلوک میں خودی کی تعلیمات تلاش کر لیتے ہیں، اور اپنے وطن عزیز کی نوجوان نسل کے لیے گیتا کے اصل پیغام کو ضروری سمجھتے ہیں اور اپنے دوست مہاراجہ کرشن پرساد شاد کو 11 اکتوبر، 1921ء کو ایک خط میں یوں رقم طراز ہیں کہ:

"زمانے نے مساعدت کی تو "گیتا" کا اردو ترجمہ کرنے کا قصد ہے۔ فیضی کا فارسی ترجمہ تو حضور کی نظر سے گزرا ہوگا۔ فیضی کے کمال میں کس کو شک ہو سکتا ہے، مگر اس ترجمے میں اس نے گیتا کے مضامین اور انداز بیان کے ساتھ بالکل بھی انصاف نہیں کیا؛ بلکہ میرا تو یقین ہے کہ فیضی گیتا کی روح سے ناآشنا رہا۔" 4

علامہ کے "فلسفۂ عمل" کی تشکیل میں "گیتا" کا اثر کارفرما ہے۔ (گو اس کا اصل سرچشمہ قرآن کا "فلسفۂ عمل اور اسلامی تعلیمات ہیں) گیتا کے ایک اشلوک کی تشریح اقبال کے اس شعر میں صاف نظر آتی ہے: ع

سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

علامہ حریت کے حامی تھے اور برطانوی سامراج کی غلامی پر بہت رنجیدہ رہتے تھے۔ ان کے ابتدائی دور کی نظم "پرندے کی فریاد" کے یہ اشعار ان کی قلبی کیفیت کے آئینہ دار ہیں: ع

آزادیاں کہاں اب وہ اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
اس قید کا الٰہی، دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں، میں غم سے مر نہ جاؤں

اسی ذہنی یگانگت کا نتیجہ ہے کہ محب وطن اقبال نے مہاتما گاندھی کی سودیشی تحریک کی بھی حمایت کی تھی، رسالہ "زمانہ" (کانپور) مئی 1906ء میں شائع ان کے مضمون سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے دل میں وطن عزیز کی بے پناہ الفت اور ملک کو خوشحال دیکھنے کی تڑپ حد درجہ موجود تھی۔ اقبال نے ملک کے نوجوانوں کے لیے جو پیغام دیا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ملک کے لیے گاندھی جی کی اس سودیشی اپناؤ کی تحریک کو بے حد ضروری گردانتے ہیں: ع

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفال ہند سے مینہ و جام پیدا کر

درج ذیل مضمون نما اسلے میں سیاسی آزادی کے ساتھ اقتصادی آزادی کی طرف توجہ دلائی اور مل کر کام کرنے کا پیغام اس والہانہ انداز میں دے رہے ہیں:

"مذہب دنیا میں صلح کرانے کے لیے آیا ہے نہ کہ جنگ کی غرض سے ۔۔۔۔۔ ہمیں مقدس عہد لینا ہے کہ ہم خارجی ممالک کی مصنوعات کا استعمال نہیں کریں گے ۔۔۔۔۔۔ اگر اس تحریک سے ہندو مسلمان میں اتحاد پیدا ہو جائے اور رفتہ رفتہ قوی ہوتا جائے تو سبحان اللہ اور کیا چاہیے۔ ہندوستان کے سوئے ہوئے نصیب بیدار ہوں اور میرے دیرینہ وطن کا نام جلی قلم سے فرق اقوام میں لکھا جائے۔" 5

جس طرح تعمیر وطن کی جدو جہد کے سلسلے میں علامہ اقبال گاندھی جی کی وسیع النظری علمی فراست اور قائدانہ صلاحیت کے قائل تھے۔ اسی طرح ملک کی اقلیتوں کے ترقی و استحکام کے لیے قائم جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ کی تقرری پر حکیم اجمل خان اور مولانا محمد علی جوہر کے مشورے سے گاندھی

جی نے علامہ اقبال سے یہ درخواست کی کہ:

''مسلم نیشنل یونیورسٹی آپ کو آواز دے رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اگر اسے اپنے ہاتھ میں لے لیں تو آپ کی فاضلانہ قیادت میں یہ ترقی کرسکے گی، میری آرزو ہے کہ آپ اس آواز کو لبیک کہیں''۔6

اس عاجزانہ انداز سے گاندھی جی کی علامہ اقبال سے عقیدت اور ان کی قیادت و دیانت کا اعتراف عیاں ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ علامہ اپنے ذاتی اعذار کی بنا پر گاندھی جی کی اس تجویز پر لبیک نہ کہہ سکے۔ اسی طرح علامہ اقبال بھی گاندھی جی کی عادات و اخلاق، اصول پسندی کے خصائل کے ساتھ تحریک آزادی میں ان کی قربانیوں کے معترف تھے۔ جن کا ذکر 21 نومبر 1921 کے روزنامہ'' زمیندار'' میں شائع ہوئی ان کی نظم'' گاندھی'' میں کرتے ہوئے اقبال نے مہاتما گاندھی کو ''مرد پختہ کار وحق اندیش و باصفا'' کہا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ بابائے قوم مہاتما گاندھی اور محب وطن علامہ اقبال دونوں اپنی اپنی قوم کو بیدار کر کے محبت کا جام پلاتے رہے تا کہ وطن عزیز غلامی کی بیڑیوں کو توڑ کر دنیا کے عظیم ملکوں میں اپنا مقام حاصل کرسکے۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کو ملک کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے نہایت ضروری قرار دیا۔ اور ان کا یہی پیغام موجودہ حالات میں بھی لازم ہے کیوں کہ قومی یک جہتی، باہمی اتحاد، باہمی محبت اور قوم پرستی کی بنیادوں پر ہی ایک نئے ہندوستان کی تعمیر کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔ یہی نہیں یہ دونوں مفکر قوم مادرِ وطن کے ہندو اور مسلمان دونوں کو ہاتھ پھیلا کر یہی دعوت دیتے ہیں: ع

آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اُٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر مِلا دیں نقشِ دُوئی مٹا دیں
سُونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شِوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلَس مِلا دیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پُجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی، شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے

علامہ اقبال کی'' ترانہ ہندی'' وغیرہ نظموں کے تعلق سے گاندھی جی کی وارفتگی و جذبات کو جہاں اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے وہیں اردو زبان وادب کی اثر آفرینی و شکر انگیزی، اور تعمیر وطن میں اس زبان کے کردار کے تعلق سے بھی گاندھی جی کی فہم و فراست قابل توجہ اور لائق اعتناء ہے۔ حب الوطنی کے جذبات سے سرشار تعمیری زبان میں لکھی گئی اقبال کی نظموں پر گاندھی جی نے جس وسعت ظرفی کے ساتھ اس زبان کے ادب و ثقافت سے ہر ہندوستانی کو جوڑنے کی کوشش کی ہے، اسی طرح تمام باشندگانِ ہند اس زبان کی اثر آفرینی سے فائدہ اٹھا کر ملک کی تعمیر میں اپنا اپنا حصہ ادا کریں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔۔۔

حوالہ جات:

1.Dr B.R. Saxena-Gandhi ji's solution to language problem in India 1970 P-7
2.مہاتما جی، ڈی تندولکر ج 7، ص 296
3.محب وطن اقبال: ص 25، مظفر حسین برنی
4.محب وطن اقبال: ص 94، مظفر حسین برنی
5.انوار اقبال: ص 25، بشیر احمد ڈار
6.Collected works of M. Gandhi vol.19 P-3

❑❑❑

غزل

بے حسی کی زد میں کیسے آ گئے
آپ اپنی رد میں کیسے آ گئے

وقت نے بخشے تھے تم کو شش جہات
تم جہت کی حد میں کیسے آ گئے

تم تو تھے اوج ثریا کے نقیب
پھر ثری کے مد میں کیسے آ گئے

وہ کہ قد آور تھے جن کے واسطے
حیف ان کے قد میں کیسے آ گئے

بت شکن اپنا تشخص بھول کر
بتکدوں کی زد میں کیسے آ گئے

ہم ہیں مثبت داستانوں کے امیں
داستان بد میں کیسے آ گئے

ایک آواز جرس تھے ہم ادیبؔ
خامشی کی حد میں کیسے آ گئے

پرویز ادیبؔ
حسین آباد، لکھنؤ
9935845335

ذاکر حسین ذاکر

گلشن حید ر،شانتی نگر۔ضلع ۔دیوریا،یوپی

9415276138

ہندی گورکھپوری کی قومی شاعری

محمد وحید اللہ انصاری موسوم بہ ہندی گورکھپوری[1917-1991] گورکھپور کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوئے۔اس خانوادے میں، جس میں تین پشتوں سے شعروشاعری دوردورہ تھا۔ان کے دادا محمد عمر دائم منجھے ہوئے شاعر تھے۔ہندی کے والد کریم اللہ خاکی ریلوے میں انجینئر تھے اوراچھے شعر کہتے تھے۔ہندی کے بڑے بھائی محمد حفیظ اللہ شادماں گورکھپوری علیگ تھے اورمعروف وکیل اور معتبر شاعر تھے۔وکالت کے سلسلے میں وہ کانپور میں آباد ہو گئے تھے۔ایسے علمی خاندان کے چشم وچراغ ہندی گورکھپوری متصوفانہ ذہن کے انقلابی شاعر تھے۔ان کی تعلیم انٹرمیڈیٹ سے آگے نہیں بڑھ پائی۔کیوں کہ وہ اس وقت تک مشاعروں کے مقبول ترین شاعر بن چکے تھے۔مشاعروں میں ان کی پوچھ اتنی زیادہ تھی کہ وہ کئی کئی ہفتوں تک گھر سے باہر رہتے تھے۔مشاعروں میں شرکت کی مصروفیت کی وجہ سے وہ ملازمت بھی نہیں کر پارہے تھے۔انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔کلکتہ کے اخبار'زمانہ'میں خبریں لکھتے رہے۔کچھ دنوں تک انہوں نے انگریزی روزنامہ پایونیر میں اسٹرنگر کا بھی کام کیا۔فیض آباد کے ملٹری ایریا میں آرمی لینگویج ٹیچر رہے۔مگر وہ کہیں ٹک نہیں سکے۔ان کی اٹھان انقلابی نظموں سے ہوئی اور یہ انقلابیت ان کے رگ رگ میں پیوست ہو چکی تھی، جیسا کہ مجنوں گورکھپوری نے ہندی کی شخصیت کو ان کی طالب علمی کے زمانے میں محسوس کیا تھا۔مجنوں نے ہی ان کی شعری اٹھان پر انقلابیت کی جومہر ثبت کی اس نے ہندی کا پیچھا ساری عمر نہیں چھوڑا۔

> ''ہندی انقلابی اور ترقی پسند شاعر ہیں اور اس وقت کوئی ادیب یا شاعر صرف ناآسودگی اور بغاوت کا پیغام دیتا ہے تو ہمارے بڑے کام کا ہے اور ہندی کی بغاوت اور ناآسودگی میں جیسا مہذب گداز اور جیسی شائستہ دردمندی ہے وہ ہمارے لئے یقیناً ایک مؤثر میلان ہے اوراس سے ہم زندگی کے ایک نئے اٹھتے ہوئے خمیر میں بڑی مدد لے سکتے ہیں۔''[1]

مجنوں نے مثال کے طور پر ہندی کی کئی نظمیں پیش کی ہیں، جو آزادی سے قبل لکھی گئی تھیں اور ان میں ترقی پسندانہ انقلابیت کا جذبہ کارفرما ہے۔مثلاً پابند سلاسل'بہار غلام کی نظر میں' مجاہد وطن'لوٹ لو'سویرا'مسلمان اور ہندوستان' دلی کا فرقہ وارانہ فساد'میں باغی ہوں نظام زندگی کا'انقلاب آرہا ہے'ظلمت کے سوا کچھ بھی نہیں وغیرہ۔یہ تمام نظمیں غنائیت' تغزل اور روانی سے بھرپور ہیں۔ہندی کے تغزل اور روانی پر ہم آگے بحث کریں گے'لیکن یہاں مجنوں نے ان کی نظم'غلامی میں لطف جوانی کہاں' کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''اگر ہندی نے یہ نظم نہ لکھی ہوتی اور صرف یہ مصرعہ کہہ کر رہ گئے ہوتے تو یہ مصرعہ ہی یادگار ہوتا۔'' مجنوں نے جس طرح ہندی کے اس مصرعے کی عظمت پر اپنے حق استحسان Power of choice کو ثبت کیا ہے'اس کو دیکھ کر غالب کے ذریعے مومن کے شعر'تم میرے پاس ہوتے ہو گویا' کے حق استحسان کی یاد آجاتی ہے'جس میں غالب اس شعر کے بدلے اپنا پورا دیوان دینے کے لئے راضی ہو گئے تھے۔

مری آرزو آرزو ہی رہی
کلی دل کی کھل جائے ایسی نہیں
مسرت ابھی میں نے دیکھی نہیں
نگاہیں ہیں گل چیں کی میری نہیں
غلامی میں لطف جوانی کہاں

> ''ہندی گورکھپوری گہوارہ علم وادب گورکھپور کے دُرِّ نایاب تھے۔آسمان ادب کے درخشندہ ستارہ۔ابھی ان کی حیثیت اور مرتبے کی شناخت کرنے میں زمانے کو بہت وقت لگے گا۔وہ معتبر شاعر تھے۔ان کی شاعری حسن وعشق کی شاعری بھی ہے اور غربت وافلاس کی ترجمانی کی شاعری بھی ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں معاشرتی نظام کی کشمکش کی بھی ترجمانی کی ہے اور ایک مجاہد آزادی کی طرح انہوں نے قومی ترقی' قومی یکجہتی' غلامی سے آزادی کی طرف کے سفر کے علاوہ ظلم ونا انصافی اور جبر وتشدد کے خلاف شاعری کی ہے، مگر ان کے شعری فہم وفراست کا اندازہ لگانے میں اردو قارئین اکثر قاصر رہے ہیں۔ یہ بات تو مسلّم ہے کہ ہندی کے لئے ان کی شاعری کو منظرعام پر لانے اوراس کا اظہار Expose کرکے دنیا سے اعتراف کرانے میں ان کی انکسار پسند طبیعت حائل تھی۔''

قفس سے آشیاں تک اشاعت 1972 میں ہوئی جب کہ مجنوں 1967 میں پاکستان چلے گئے تھے۔ مجنوں نے یقینا یہ نوٹ 1965 سے قبل لکھا ہوگا لیکن اس کی اشاعت 1972 میں ہوسکی۔ قفس سے آشیاں تک میں جتنی نظمیں شامل ہیں' سب کا لہجہ tone باغیانہ ہے۔ بعد میں جب ہم ہندی کی نظموں سے ان کی شخصیت کی تپش سے مماثلت کا مطالعہ کرتے ہیں تو دونوں میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ بعد کا ہندی 1960 سے قبل کے ہندی سے زیادہ سرد' نرم خو اور ملائم نظر آتا ہے۔ بعد کے ہندی نے گھن گرج والی نظمیں نہیں کہیں بلکہ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں' جن کا لہجہ بہت ملائم نرم اور عاشقانہ ہے۔ کچھ رومانی نظمیں اور گیت بھی لکھے ہیں جن کا لہجہ بہت شائستہ ہے۔

تری خاطر نہ سمجھا زندگی کو زندگی میں نے
لٹا ڈالی جوانی بھی بنام عاشقی میں نے
زمیں سے آسماں تک میری ہستی کا تصرف ہے
گلوں کو رنگ بخشا مہر و مہ کو روشنی میں نے

ہندی گورکھپوری گہوارۂ علم وادب گورکھپور کے درنایاب تھے۔ آسمان ادب کے درخشندہ ستارہ۔ ابھی ان کی حیثیت اور مرتبے کی شناخت کرنے میں زمانے کو بہت وقت لگے گا۔ وہ معتبر شاعر تھے۔ ان کی شاعری حسن وعشق کی شاعری بھی ہے اور غربت وافلاس کی ترجمانی کی شاعری بھی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں معاشرتی نظام کی کشمکش کی بھی ترجمانی کی ہے اور ایک مجاہد آزادی کی طرح انہوں نے قومی ترقی' قومی یکجہتی' غلامی سے آزادی کی طرف کے سفر کے علاوہ ظلم و ناانصافی اور جبر وتشدد کے خلاف شاعری کی ہے۔ مگر ان کے شعری فہم وفراست کا اندازہ لگانے میں اردو قارئین اکثر قاصر رہے ہیں۔ یہ بات تو مسلم ہے کہ ہندی کے لئے ان کی شاعری کو منظر عام پر لانے اور اس کا اظہار Expose کرکے دنیا سے اعتراف کرانے میں ان کی انکسار پسند طبیعت حائل تھی۔ انہیں مرزا غالب کی طرح سخنوران کا ملان گورکھپور کے سامنے اپنے بیانیہ کو مضبوطی سے پیش کرنا چاہئے تھا۔ جیسا غالب نے کیا۔ وہ ذوق سے ہمیشہ متصادم رہے اور اس تصادم میں وہ شہنشاہ ظفر سے بھی ٹکرا جاتے تھے۔! بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا' جیسی پیش رفت ہندی نے اپنایا ہوتا تو ہم آج ایک دوسرے غالب سے روبرو ہو رہے ہوتے۔ ہندی شعلۂ گل میں لکھے اپنے ایک مختصر نوٹ 'کیا میں اور کیا میری شاعری۔۔۔؟' میں خود اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی شاعری کا مسلک رجائیت پسندی Optimistic رہا ہے۔

''میری زندگی کا مسلک انتہار جائی اور شاعری میں میرا مسلک ادب برائے زندگی ہے۔ میری شاعری ہمیشہ مقصدی اور تعمیری رہی ہے۔''[2]

شعلۂ گل 1984 میں شائع ہوا۔ اس میں 125 غزلیں شامل ہیں۔ ان میں جنس گراں کی غزلیں بھی شامل ہیں۔ شعلۂ گل کی غزلوں میں 1930 تک کی غزلیں شامل ہیں یعنی 13 سال کی عمر میں کہی ہوئی غزلیں بھی شعلۂ گل کی زینت بنی ہیں۔ رومانی نظمیں اور کچھ گیت بھی ہیں۔ رومانی نظمیں غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں محبت' اپنی۔۔۔ کے نام' کیا تم مجھ سے اب نہ ملوگی' یاد رفتہ' نامہ و پیام' دل' محبت اور خدا' ہم تم' آؤ چلیں اس پار' بارگاہ حسن میں' میں طائر ہوں وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں حسن وعشق کے فسانے تو اپنی جگہ پیش کئے گئے ہیں مگر ان میں نغمگی اور روانی بھی بہت ہے۔ ان تمام دلکش نظموں کو ہندی گورکھپوری مشاعروں میں اپنی پرکشش آواز میں ترنم کے ساتھ پڑھ کر سامعین کو مسحور کر دیا کرتے تھے۔ سامعین ان نظموں کے جادو میں کھو جاتے تھے۔ مثلاً ''میری نظر کے آنسوؤں میں یوں ہی حسرت بن کے بھوگی۔ کیا تم مجھ سے اب نہ ملوگی' 'یا'' میری زبیدہ چھوڑو بھی اس ہستی کے جنجالوں کو' آؤ چلو اس پار چلیں۔'' یا ایک دوسری نظم ہے' اپنی۔۔۔ کے نام 'جہان آب وگل سے دور اک دنیا بساؤں گا۔ محبت کے حسین پھولوں سے میں اس کو سجاؤں گا۔' اس نظم میں کھل کر شاعر اپنی معشوقہ کے لئے ایک نئی دنیا بسانے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ عنوان میں اس کا نام حذف کر دیا گیا ہے۔ جب کہ آؤ چلیں اس پار' میں شاعر نے خاص طور سے زبیدہ کا نام لیا ہے۔ رومانی نظموں میں جتنے عنوانات شامل ہیں ان کا لہجہ مدھم رواں اور جذبوں میں تپش کا عنصر نمایاں ہے۔ ہندی کی ایک نظم' ہم تم' ہے۔ اس خوبصورت نظم میں بھی وہ اپنی معشوقہ سے کہیں دور دوسری دنیا میں جانے کی یقین دہانی کرا رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ دنیا ان کے جذبوں اور خواہشات کی تکمیل کی اہل نہیں ہے۔ ہندی کی یہ نظم اعلیٰ درجے کی رعنائی خیال کی مظہر ہے۔

جہاں بھی چلیں ماہ و انجم چلیں گے
یہاں سے بہت دور ہم تم چلیں گے

غالب کا ایک شعر ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

ہندی گورکھپوری نے غالب کے اس شعر سے بہت گہرائی سے اثر قبول کیا ہے۔ انہوں نے اس خیال کو اپنی تین نظموں اور دو غزلوں میں وسعت دی ہے اور ہر جگہ ان کے خیالات میں تازگی نظر آتی ہے۔ آج سائنس نے آسمان کی وسعتوں اور زمین کی خلا میں سیارے نصب کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زمین وآسمان کے درمیان کہیں خوبصورت منظر بنایا جا سکتا ہے۔ سائنس چاند اور مریخ پر انسانی آبادی کے امکانات کی تلاش میں بھی سرگرداں ہے۔ مگر اس خواب کو غالب نے دو سو سال قبل دیکھا تھا۔ انہوں نے دنیا کے مکر وفریب' تنگ دامانی' ظلم وزیادتی' فتنہ وفساد' بے اطمینانی وبے چینی سے پریشان ہوکر ایک پرسکون جگہ کی تعمیر کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اسی خیال کو ہندی نے بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یقینی طور پر ہندی کے تخیلات غالب کے ذہنی اڑان سے بہت پیچھے ہیں مگر انہوں نے کوشش بہت اچھی کی ہے۔

چلو اک نیا آشیانہ بنائیں
زمانے سے آگے زمانہ بنائیں
بلندیٔ عرش بریں سے بھی آگے
بنائیں اگر آشیانہ بنائیں
دنیا سے دور ہٹ کے تو اپنا جہاں بنا
یعنی نئی زمیں نیا آسماں بنا

ہندی نے ایک سانیٹ میں بھی ہوبہو اسی خیال کو پیش کیا ہے۔

دور اس دنیائے آب و گل سے دور
اک نیا عالم بساؤں گا میں اب

ان کی نظم' اپنی۔۔۔ کے نام' کے پہلے شعر میں اسی خیال کی ترجمانی کی گئی ہے۔

جہان آب و گل سے دور اک دنیا بساؤں گا
محبت کے حسیں پھولوں سے میں اس کو سجاؤں گا
مہ و انجم میں کیف نور بن کر جگمگاؤں گا
میں تم کو ساتھ لے کر اس افق کے پار جاؤں گا

'دور اس دنیائے آب وگل سے دور' اور 'جہان آب وگل سے دور اک دنیا بساؤں گا' یہ دونوں مصرعے آپس میں متصادم ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندی کے ذہن میں یہ خیال کتنا ہنگامہ برپا کئے ہوئے تھا۔ ہندی اپنے ذہنی اتھل پتھل کو سنبھال پانے سے قاصر تھے اور بار بار یہ خیال ان کے قلم کی نوک سے ٹپک پڑنے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔ ہندی کی ایک نظم' آؤ چلو اس پار چلیں' میں بھی غالب کے اس شعر کی جھلک ملتی ہے۔ اس نظم میں ہندی نے باقاعدہ اپنی معشوقہ کا

نام بھی لیا ہے۔اختر شیرانی نے اپنی زیادہ تر رومانی نظمیں سلمیٰ، صفیہ، نسیمہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔جاں نثار اختر نے بھی کچھ ایک نظموں میں صنف نازک کے ناموں کا ذکر کیا ہے۔ہندی نے بھی اس روایت پر عمل کرتے ہوئے اس نظم کو زبیدہ کے نام سے منسوب کیا ہے۔

میری زبیدہ، چھوڑو بھی اس ہستی کے جنجالوں کو
اس پریت کے تیکھے تیور کو ان آہوں کو ان نالوں کو
اس پھیکی پھیکی محفل کو ان خالی خالی پیالوں کو
اس پار کے رہنے والوں کو محکوموں کو کنگالوں کو
آؤ چلو اس پار چلیں

شاعری میں ترنم، غنائیت اور نغمگی بھی اسی طرح ضروری ہے جیسی روانی۔ہندی کی شاعری کا اہم عنصر نغمگی اور روانی ہے۔نغمگی اور روانی شاعری کا خمیر ہے۔انگریزی نقاد اور شاعر سوین برن نے اچھی شاعری میں جن چیزوں کی ضرورت پر زور دیا ہے، اس میں ایک شرط آہنگ کا ہونا بھی ہے۔جیسا سوین برن کہتا ہے۔اگر کسی شعر میں روانی نہیں ہے تو اس میں آہنگ کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ہندی کی رومانی نظمیں، غزلیں یا انقلابی نظمیں سبھی اسی زیر و بم کے اثر میں بندھی ہوئی ہیں۔شعلۂ گل ہو یا قفس سے آشیاں تک کہیں سے مثال کے طور پر تغزل اور نغمگی سے مزین اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں۔ہندی اس کی وضاحت تھوڑی تفصیل سے کرتے ہیں۔

"اگر نظموں کی طرح غزلوں میں بھی زندگی کے ترقی پسند عناصر اور مستقبل کی تابناکیاں سمودی جائیں تو 'ادب برائے زندگی' کے ادعا کی تکمیل ہوجائے۔چنانچہ میں نے سیاسی، قومی اور انقلابی رجحانات و جذبات کو غزلوں میں سمویا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشاعروں قومی اور انقلابی نظموں کے علاوہ میری ان غزلوں کا رنگ زیادہ جمنے لگا، جو اپنی تمام فصاحت، نغمگی اور روانی کے ساتھ سیاسی اور انقلابی رجحانات کی حامل تھیں۔"[3]

شعلۂ گل کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

اے سکون دل، اے قرار جاں، مری چھیڑ پر نہ ہو بدگماں
یہ دمکتے تارے، یہ کہکشاں، تو کہے تو نوچ کے لاؤں میں
دم صبح اٹھ کے بصد ادا مرے پاس سے جو چلی ہو تم
مرا عشق مجھ سے مچل گیا کہ سحر کو رات بناؤں میں
وہ ملیں گے ہندی سے اب کے گر، تو بہ شوق پوچھوں گا ان سے میں
جو لکھی ہے میں نے غزل نئی، مجھے حکم ہو تو سناؤں میں

یہ غزل بہت طویل نہیں ہے۔اس میں صرف پانچ شعر ہیں۔مگر اس میں حسن وعشق کی پوری جلوہ افروزیاں اپنے عروج پر نظر آرہی ہیں۔دم صبح اٹھ کے بصد ادا۔۔۔اس شعر میں شب کے دوران وقوع پذیر ہونے والے تمام واقعات کا اظہار کھل کر کیا گیا ہے۔عاشق اپنے محبوب سے اپنے اختلاط وتلذذ کا بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ صبح جو تم جانے لگی تو عشق مچل گیا۔یہاں غور کرنے والی بات یہ ہے کہ اردو شاعری کی قدیم روایات سے انحراف کرتے ہوئے شاعر نے محبوب کو صیغہ تانیث میں پیش کیا ہے۔یہ نہیں کہ محبوب جانے لگا، بلکہ وہ کھل کر کہتا ہے کہ جب تم جانے لگی تو عشق نے مچل کر مجھ سے کہا کہ میں سحر کو شب میں بدل دوں، تا کہ اس کا محبوب اس کے پاس مزید قیام کرنے پر مجبور ہو جائے۔عاشق کا جذبہ عشق بہت بیدار ہے اور وہ اپنے محبوب کے لئے دمکتے تارے اور کہکشاں تک نوچنے کی بات کرتا ہے کہ کچھ بھی ہو اس کا محبوب اس سے ناراض نہ ہو۔ہندی کی شاہکار نظم 'ہمارا وطن' ہے، جسے انہوں نے 1952 میں لکھی تھی۔ہندی کا دعویٰ ہے کہ اس سے قبل اس طرز پر اردو میں کوئی نظم نہیں تھی اور اس کے بعد اس طرز پر سیکڑوں نظمیں لکھی گئیں۔ہندی نے اس نظم کو سب سے پہلے اردو کانفرنس بستی کے مشاعرے میں پڑھی تھی۔یہ نظم کافی طویل ہے اس کے دو حصے ہیں۔ہمارا وطن اور اس کا دوسرا رخ ہے۔نظم میں ترکیبیں اور استعارے بے حد آسان فہم اور دلکش ہیں۔ہندی کو بھی اپنی نظم کی معنویت اور اس کی عظمت کا خوب احساس تھا۔

اس کے پربت غنیموں کو ہمت شکن
اس کے رکشک یہ صحرا یہ انمول بن
اس میں ارجن کا دل ہیر کا بانکپن
اس کی ہر اک کلی ہے چمن در چمن
رشک لعل یمن رشک درعدن
یہ ہمارا وطن ہے ہمارا وطن

اگر حسین، غنائی اور پرکشش نظموں کا ذکر کیا جائے تو 'سویرا' ایک ایسی ہی نظم ہے، جس میں آج بھی اسی طرح تر وتازگی محسوس ہوتی ہے۔ہندی اکثر اپنی مترنم آواز میں اس نظم کے بند کو پڑھ کر صبح اپنے اپنے سورہے بچوں کو جگایا کرتے تھے۔

گلشن میں کھلائیں اب کے ہم اس طرح کے رنگیں گل بوٹے
مہکا دے جہاں خوشبو جن کی اور رنگ نہ پھر جن کا چھوٹے
دامن نہ بھریں جو گل چیں کا جن کو نہ خزاں آ کر لوٹے
اے غنچو! اٹھو! جاگو! کہ صبا پیغام مسرت لائی ہے

ہندی کی ایک بہترین نظم کا عنوان ہے 'لوٹ لو'۔یہ نظم تحریک 1942 سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔نظم بہت خوبصورت ہے۔اس میں شاعر عوام کو پیغام دے رہا ہے کہ اگر گلستاں تمہارے واسطے نہیں ہے تو اسے بھی لوٹ لو۔انہوں نے قاری کو تحکمانہ لہجہ میں مخاطب کیا ہے۔یہ پوری نظم فرمان شاعر ہے۔جس میں ہدایات جاری ہوئی ہیں 'جو تم سے سرکشی کرے اس کارواں کو لوٹ لو'۔ 'تمہارے واسطے نہیں تو گلستاں کو لوٹ لو' وغیرہ وغیرہ۔اس نظم میں کل آٹھ شعر ہیں اور ہر شعر میں نئے لفظیات اور نئی ترکیبوں کا استعمال کیا گیا ہے۔

لگا کے نعرۂ عمل، زمیں زماں کو لوٹ لو
تمہارے ولولے جواں ہیں دو جہاں کو لوٹ لو

ہندی نے قطعات بھی کہے ہیں۔ان قطعات میں ان کا رعنائی خیال اپنی انتہا پر ہے۔سب سے پہلے یہ قطعات شرارے کے نام سے ایک کتابچہ میں شائع ہوئے تھے۔لیکن یہ کتابچہ بھی دستیاب نہیں ہے، مگر یہ قطعات قفس سے آشیاں تک میں شامل ہیں۔قفس سے آشیاں تک میں کل 26 قطعات شامل ہیں۔انہیں قطعات کو شعلۂ گل میں جگہ دی گئی ہے۔شعلۂ گل میں 30 قطعات شامل ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندی نے ان دس سالوں میں صرف چار قطعات ہی کہے تھے، جنہیں شعلۂ گل میں اضافے کے ساتھ شامل کیا گیا۔ان قطعات میں لوٹ لو، یا بغاوت کے نعرے لگاتے چلو جیسی فرمان بندی کا جلوہ کچھ زیادہ ہی نظر آتا ہے۔ان میں آتش سیال کی سی تپش ہے۔ہر قطعہ ایک نئے موضوع پر ایک نیا فرمان سناتا ہوا نظر آتا ہے۔اس کے باوجود ان میں غزلوں جیسی نغمگی، تغزل اور روانی پائی جاتی ہے۔ہندی ان قطعات میں جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ غلامی اور محکومی کے دائرے میں سمٹ چکی ہے۔حالانکہ اس میں ہمیں کچھ دلچسپ اور نئی ترکیبیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔مثلاً غلامی کا دل، غلامی اور پستی، ہم غلام سہی، حیات اس کے لئے ہے کہ جو غلام نہیں، قاطع غلام ہوں، غلامی کا جواز، دل غلام

’غلام موت سے ڈرتے ہیں‘ دست محکومی‘ نظام کہنہ کی تجدید‘ آفتاب غلامی وغیرہ۔

شرارے میں ملک زادہ منظور احمد نے ایک مختصر نوٹ لکھا تھا۔جس میں انہوں نے ہندی کی باغیانہ جرأت کو سلام کیا ہے:

”قطعات کی صورت میں یہ بکھرے ہوئے شرارے ’غلامانہ ماحول‘ سامراجی بیڑیوں اور غیر ملکی بندشوں میں جکڑے ہوئے جسم کے آزاد جذبات اور احساسات کی وہ للکار ہے‘ جس کی شعلہ فشانیوں نے 1942 کے انقلاب میں بکنگھم پیلیس کے ’ساحر الموط‘ کی خود ساختہ جنت کو جھلس دیا اور جس نے 1947 میں ظفر شاہ‘ بھگت سنگھ‘ جھانسی کی رانی اور دیگر قومی شہدأ کے مزاروں پر عقیدت کے پھولوں کی چادر چڑھائی۔ہندی کی یہ باغیانہ جرأت اور وہ بھی ایک ایسی محفل میں جہاں بات بات پر زبان کٹتی تھی قابل ستایش ہے۔“[4]

مجھے حیات کی رنگینیوں سے کام نہیں
مری سحر نہیں دنیا میں میری شام نہیں
مری حیات فسردہ مرا وجود عدم
حیات اس کے لئے ہے کہ جو غلام نہیں

ہندی نے نثر میں کوئی بڑا ذخیرہ نہیں چھوڑا ہے۔سوائے اپنے دونوں مجموعوں میں پیش لفظ اور تعارف لکھنے کے یہ چند اوراق دیکھنے سے ان کے وسعت خیال کا اندازہ لگانا کوئی دشوار کام نہیں ہے۔ان کی نثر میں اعلیٰ درجے کی سادگی ہے۔ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔انہوں نے شاعری کی طرح نثر کو بھی خوبصورت لفظیات سے آراستہ کیا ہے۔ہندی گورکھپوری شاعری اور شاعر کی اہمیت وافادیت کو مسلم گردانتے ہوئے ڈاکٹر ہیگو کی مثال پیش کرتے ہیں جس نے کہا تھا کہ زماں ومکاں شاعر کی ملکیت ہیں‘ اسے جہاں چاہے جانے دو اور جو چاہے کرنے دو۔یہ صحیح ہے کہ لفظ اور استعارے کے علاوہ شاعر کی نقل وحرکت میں بھی آزادی کامل ہونی چاہیے۔شاعر کو پابند سلاسل کرنا معاشرتی نظام پر قدغن لگانے جیسا ہے۔انہوں نے ولیم بلیک کی مثال دی ہے‘ جس نے کہا تھا کہ محدود شاعری انسانی نسل کو بھی محدود کر دیتی ہے۔ہندی آگے لکھتے ہیں:

”شاعری تو دراصل اس آبشار کے مانند ہے جو کسی فلک بوس پہاڑ کی عظیم ترین چوٹی سے گر رہا ہو اور جس کے لئے اس کائنات ارضی وسماوی میں کہیں بھی بندش اور رکاوٹ نہ ہو۔مگر یہ ساری آزادیاں اس کی متقاضی ہیں کہ اس کی تمام جولانیاں‘ اس کی تمام حقیقت بیانی‘ خیال آرائی اور نقل وحرکت اس کے قلب صفا اور اس کی روشن ضمیری کی آئینہ دار ہوں۔اس کا خلوص بے پناہ‘ اس کا عمل خود غرضی اور اس کے ذہن و دماغ زندگی کے سارے تنگ وتاریک گوشوں سے پاک ہو۔[5]

حوالہ۔

1۔قفس سے آشیاں تک از ہندی گورکھپوری مرتبہ۔ثمینہ ادیب ضیا حالی پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔دوسرا ایڈیشن۔2021۔ص۔14

2۔شعلہ گل از ہندی گورکھپوری۔نشاط پریس ٹانڈہ۔1984 ص۔9

3۔قفس سے آشیاں تک ص۔22

4۔قفس سے آشیاں تک۔ص۔140

5۔قفس سے آشیاں تک۔ص۔21

❑❑❑

غزل

ہوں دائرہ مرکز میں سمٹ کر نہیں آیا
محور سے کبھی اپنے میں ہٹ کر نہیں آیا

ہے میرے سفرنامے کا وہ مرکزی کردار
جو گرد سفر میں کبھی اَٹ کر نہیں آیا

زندہ ہیں ابھی مجھ میں سب اسلاف کی قدریں
واللہ میں تہذیب سے کٹ کر نہیں آیا

بازی وہاں شطرنج کی ایک اب بھی لگی ہے
یعنی میں بساط اپنی الٹ کر نہیں آیا

تھے مرحلے درپیش بہت ذات وزباں کے
لیکن میں کبھی خانوں میں بٹ کر نہیں آیا

ہے فلسفۂ شعروادب سے مجھے رغبت
حافظ کی طرح میں کوئی رٹ کر نہیں آیا

میدان میں لے آیا جسے ذوقِ شہادت
غازی وہ عدو سے کبھی گھٹ کر نہیں آیا

پروفیسر نوید الیاس گنوری
مسجد فیض عام کے سامنے
9897454714

ڈاکٹر شاہد احمد

کالکا ماتا ٹمپل، گنیش نگر، ادے پور، راجستھان

8107868785

1857ء کی جنگ آزادی اور مسلم علماء

شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال فرماتے ہیں ۔

اے آبِ رودِ گنگا کیا دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

دنیا کا پہلا انسان، پہلی اذان، پہلی نماز، پہلی تسبیح، پہلی تکبیر، پہلی توبہ، پہلی دعا، پہلی ادا، پہلی صدا، پہلی ندا اور پہلے آنسو نے جس زمین کو سرسبز وشاداب کیا ہے اور جس خطے کی طرف کعبتہ اللہ کا سب سے افضل ترین رکن ''رکن اسود'' ہے وہ ہمارا ملک ہندوستان ہے ۔

ہمارا ملک اللہ رب العزت کی خاص توجہ کا مرکز ہے اس کا اندازہ حضور سرور کائنات کے اس قول سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''ہند سے عاشقوں کی خوشبو آتی ہے ۔

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جدھر سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

تاریخ کے اوراق کو جب ہم الٹ کر دیکھتے ہیں تو زمانہ قدیم سے ہی اہل عرب اور ہندوستان کے تعلقات اور آمد ورفت کے ٹھوس شواہد ملتے ہیں خواہ وہ تجارتی ہی کیوں نہ ہو۔ اہل عرب اور فارس کی شاعری میں ملک ہندوستان کا جا بجا تذکرہ ملتا ہے ۔ تاریخ اسلام کے مطابق ہندوستان کا سب سے قدیم مذہب ''اسلام'' ہے چونکہ اسلام کے پہلے پیغمبر اور دنیا کے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام اسی خطے پر تشریف لائے تھے ۔ اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسانیت کی تاریخ ۔

ملک ہندوستان میں محمد بن قاسم سے لے کر مغلیہ حکومت تک کئی مسلم حکمرانوں نے یہاں کے نظام جہاں بانی سے ایک انقلاب پیدا کیا اور ملک ہندوستان کو سونے کی چڑیا بنا دیا ۔ نیز بادشاہوں کے ساتھ صوفیائے کرام نے بھی اپنے اخلاق و کردار سے یہاں کی تہذیب وتمدن میں اپنا اہم کردار ادا کیا اور اہل ہند کے دلوں پر اپنا نقش قائم کیا لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ ایک طرف زمین کے فاتح اور دوسری طرف ضمیر کے ۔

مسلم حکمران نے ہندوستان کو دیارِ غیر سمجھ کر لوٹ مار اور قتل وغارت نہیں کی بلکہ اسے اپنا آبائی وطن سمجھ کر خوب ترقی اور فروغ کو انجام دیا ۔ جس کی زندہ مثالیں تاج محل آگرہ، لال قلعہ دہلی، فتح پور سیکری قطب مینار دہلی، بلند دروازہ گجرات، شالیمار باغ کشمیر، ہمایوں کا مقبرہ دہلی، شیر شاہ سوری کا مقبرہ بہار، قابلی مسجد پانی پت، چار مینار حیدر آباد جیسی عمارتیں ہیں ۔ جس کی منظر کشی علامہ عبیداللہ خاں اعظمی نے یوں کی ہے ۔

ہند کو ناز ہے جس پر وہ نشانی ہم ہیں
تاج اور لال قلعہ کے یہاں بانی ہم ہیں

اسی سلسلے میں میسور کے سلطان ٹیپو کا تذکرہ بے حد ضروری ہے جنھوں نے سب سے پہلے انگریزوں کے خلاف جنگ کا پرچم بلند کیا ۔ یہ مرد مجاہد اور محب وطن اپنی زندگی کی آخری سانس تک انگریزوں کے خلاف نبرد آزما رہا مگر افسوس ملک کے کچھ غداروں نے ٹیپو کا ساتھ نہیں دیا لیکن صداقت کا یہ بانی شیر میسور اپنے ہی قول: ''شیر کے ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے'' پر عمل کرتے ہوئے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو سرنگا پٹنم کی سرزمین پر سپرد خاک ہوا ۔

اے شہید مرد میدانِ وفا تجھ پر سلام
تجھ پہ لاکھوں رحمتیں لا انتہا تجھ کو سلام

''آپ آزادی کے مرد مجاہد ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پائے کے مصنف بھی تھے ۔ آپ کی درجنوں تصانیف وحواشی ہیں ۔ قید خانے کی تنہائی میں آپ نے 'الثورۃ الہندیہ' (باغی ہندوستان) تحریر کی جو انقلاب آزادی کا ایک مستند ترین ماخذ ہے ۔ علامہ کی ایک منظوم تصنیف 'قصائد الہند' کو جزیرہ انڈمان (کالا پانی) سے ۱۸۶۰ء میں کوئلہ اور پنسل سے کپڑے پر لکھی ہوئی تحریر بذریعہ مفتی عنایت احمد کاکوروی اپنے فرزند مولانا عبدالحق خیر آبادی کے پاس بحفاظت پہنچایا جس پر مولانا ابوالکلام نے تعارف لکھا اور جسے مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی نے ۱۹۴۶ء کو ترجمہ کر کے شائع کیا ۔ بعد ازاں مجمع الاسلامی مبارکپور سے حواشی اور بعض اہم مضامین کے اضافے کے ساتھ ''باغی ہندوستان'' کی اشاعت عمل میں آئی ۔''

ہند کی قسمت ہی میں رسوائی کا سامان تھا
ورنہ تو ہی عہدِ آزادی کا ایک عنوان تھا
اپنے ہاتھوں خود تجھے اہلِ وطن نے کھو دیا
آہ کیسا باغ ہاں شامِ چمن نے کھو دیا

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور علماء کی داستان بڑی لرزہ دینے والی ہے۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو کچلنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ لاہور کی شاہی مسجد میں ایک دن میں اسی اسی علماء کرام کو پھانسی دی جاتی تھی۔ لاہور کے دریائے راوی میں علماء کو بوریوں میں بند کر کے بہا دیا جاتا تھا اور اوپر سے ان پر گولیاں چلائی جاتی تھی۔ غرضیکہ ایسے ایسے مظالم ڈھائے گئے جس کا تصور ہی آج ہمارے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔

دنیا سے آج پوچھوں پیچھے نہیں ہیں ہم
انگریز لے رہا تھا جب امتحاں ہمارا
زد میں بھی گولیوں کی مقصد ہم نے نہ چھوڑا
قیدوں میں بھی نہ بدلہ عزم جواں ہمارا
ریلوں میں راستوں میں جیلوں میں محفلوں میں
نعرہ تھا ہم کو دے دو ہندوستاں ہمارا

ایسے مردم شناس مجاہدین اور وطن پرستوں کی فہرست میں جو اہم نام ہیں ان میں علامہ صدرالدین آزردہ دہلوی، علامہ فضل حق خیرآبادی، علامہ فیض احمد رسوا بدایونی، مولانا سید کفایت علی کافی، دلاور جنگ مولانا احمداللہ شاہ مدراسی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا امام بخش صہبائی دہلوی، مولانا رضا علی خاں بریلوی کا تذکرہ اہم ہیں۔ جن کی مختصراً تفصیل ملاحظہ ہو:

۱) علامہ صدرالدین آزردہ دہلوی: مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباو اجداد کشمیری تھے۔ موصوف تمام علوم خواہ وہ نحو ہو، منطق ہو، ریاضی ہو، معانی و بیان ہو، انشاء، فقہ اور حدیث وتفسیر ہو گویا کہ ہر فن میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ آپ کا دولت کدہ اس وقت کے اکابر علماء و فضلا و ادباء و شعرا کا مرکز تھا۔ آپ کے حلقہ ارباب میں اپنے دور کی کئی عظیم شخصیات تھیں۔ جن میں علامہ فضل حق خیرآبادی، مولانا امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومنؔ، مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، شاہ نصیرالدین نصیرؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، وغیرہ اہم ہیں۔ 'گل رعنا' میں حکیم عبدالحئی بریلوی لکھتے ہیں کہ:

''جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا''۔

(گل رعنا، حکیم عبدالحئی ص ۲۲۷، چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء ص ۴۱)

آپ کی جامعیت، قوت حافظہ، حسن تحریر، متانت، تقریر، فصاحت بیان، بلاغت معانی اور فنون ادبیہ میں کامل دسترس حاصل تھی جس کا اعتراف شیفتہؔ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''در فنون ادبیہ ثانی اعشٰی و جریرست و درمراتب حکمیہ ثالث باقر و نصیر''۔

(مرجع سابق ص ۴۴)

مفتی صاحب کی دانش مندی کا ہی کمال تھا کہ بہادر شاہ ظفر بھی ان کے معترف تھے۔ فرماتے تھے کہ جو معاملات سلجھانے کی صلاحیت مفتی صاحب میں تھی اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء کے وقت بعض مواقع ایسے آئے جب مجاہدوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس وقت مفتی صاحب کی ہی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف آزادی کا پرچم بلند کیا۔

پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران بریلی سے جب جنرل بخت خاں تقریباً چودہ ہزار انقلابیوں کی فوج لے کر انگریزوں کے خلاف آغاز جولائی کو جہاد کا الم بلند کر دہلی پہنچے اس وقت انگریزوں کے خلاف ایک فتویٰ جاری ہوا۔ جس پر ۳۸ مفتیان کرام کے دستخط تھے جن میں مفتی آزردہ دہلوی بھی شامل تھے۔ یہ فتویٰ 'اخبارالظفر' دہلی سے شائع ہوا تھا۔ نیز اس کی نقل 'صادق الاخبار' دہلی بتاریخ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کو چھپی تھی۔ یہ اخبار آج بھی نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہے۔

مفتی صاحب کو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ فساد میں تعلق روزگار اور اپنی جائداد و املاک سے ہاتھ دھونا پڑا حتیٰ کہ جہاد کے فتویٰ کے الزام میں چند ماہ تک جیل خانہ میں بھی بند رہے۔ بعد میں جرم ثابت نہ ہونے کے باعث رہا کر دیئے گئے۔ آپ نے اکیاسی سال کی عمر میں بمرض فالج ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کو اس دنیا سے کوچ کیا۔

۲) علامہ فضل حق خیرآبادی: علامہ فضل حق خیرآبادی کو تحریک آزادی کا محرک اول تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ کی ولادت دہلی کے صدرالصدور حضرت علامہ فضل امام فاروقی خیرآبادی کے یہاں ہوئی۔ تعلیم وتربیت اپنے والد کے علاوہ شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے حاصل کی محض تیرہ سال کی عمر میں علوم نقلیہ وعقلیہ کی تکمیل کر لی۔ عربی زبان کے ماہر ادیب وشاعر تھے۔ علاوہ ازیں بہت بڑے سیاست داں، مفکر اور مدبر تھے۔ آپ کا یہ عالم تھا کہ مسند درس پر بیٹھ کر علوم وفنون کی تعلیم دیتے اور ایوان حکومت میں پہنچ کر دورس فیصلے کرتے تھے۔ بہادری وشجاعت آپ کا خاصا تھی۔ صدرالصدور، حضور تحصیل، سررشتہ دار اور دیگر کئی بڑے عہدوں پر فائز رہے۔

'آب حیات' میں محمد حسین آزاد مولانا فضل حق خیرآبادی کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

''علامہ فضل حق خیرآبادی نے ہی مرزا غالبؔ کے دیوان سے مشکل اشعار نکال کر اسے ایسا بنا دیا کہ لوگ آج اسے عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں''۔

(۱۸۵۷ء پس منظر و پیش منظر، ص ۲۱۶)

تذکرہ شعرائے اردو 'گل رعنا' میں مولانا حکیم سید عبدالحئی لکھتے ہیں:

''جب مولانا فضل حق نے روک ٹوک شروع کی تو ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ مولانا کی تحریک سے مرزا نے اپنے کلام سے دو ثلث کے قریب اشعار نکال ڈالے اور اس کے بعد اس روش پر چلنا چھوڑ دیا''۔

(گل رعنا، ص ۲۱۳)

آپ کے دولت خانے پر ہر وقت علماء، ادباء و شعراء کی محفل سجی رہتی تھی۔ غالبؔ، مومنؔ، صہبائیؔ، آزردہؔ، احسانؔ، نیرؔ، نثارؔ، شیفتہؔ، ضمیرؔ، مجلسؔ کی رونق تھے۔ اس کے متعلق علامہ عبدالشاہد شیروانی رقم طراز ہیں کہ:

''اندازہ لگائیے کہ اکبر بادشاہ کے شاہی دربار سے یہ دربار کسی طرح کم نہ تھا؟ بادشاہ نے لاکھوں روپے صرف کر کے نورتن جمع کئے تھے اور ان شاہان علم نے اپنے حسن اخلاق سے سینکڑوں باکمال حضرات کو درباری بنا لیا تھا''۔

(باغی ہندوستان، ص ۱۶۲۔۱۶۳)

آپ کی علمیت ومقبولیت کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ معرکہ ستاون کے دوران بہادر شاہ کے دارالانشاء سے جو بھی حکم جاری ہوتا تھا۔ اس میں علامہ کا مشورہ سرفہرست تھا خواہ وہ مجاہدین کی اعانت روپے اور سامان رسد سے ہو، اہل کار حکم کا تقرر ہو یا والیان ریاست کو جنگ میں اعانت وشرکت کی دعوت ہو۔ ہندوستان کی متحدہ ہندو مسلم تہذیب اور اہل وطن کی متفقہ جدوجہد کو برقرار رکھنے کی علامہ نے خوب کوشش کی۔ جنگ کے دوران شاہی فوج کی کمان بھی سنبھالی۔ غیر ملکی غاصبوں کے خلاف جہاد کا الم بلند کیا۔ علامہ نے سلطنت کا جو دستور العمل بنایا تھا اس کے نفاذ کے لئے بہادر شاہ نے ایک مجلس کا انتخاب کیا جس کا نگراں ڈائریکٹر علامہ فضل حق خیرآبادی کو بنایا گیا۔ بعد ازاں ۱۹ ستمبر کو دہلی پر انگریزی تسلط قائم ہونے کے سبب علامہ اودھ میں بیگم حضرت محل کے ساتھ سرگرم عمل ہو گئے۔

۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط قائم ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر گرفتار کر لئے گئے۔ فتویٰ جہاد کے الزام میں علامہ فضل حق خیرآبادی پر لکھنؤ میں مقدمہ چلا جس کی پیروی تمام قانونی دلائل کی روشنی میں آپ خود انجام دیتے تھے۔ موصوف کا یہ رنگ دیکھ کر جج خود پریشان حال تھا۔

ایسی صورت حال معلوم ہو رہی تھی کہ آپ بری ہو جائیں گے مگر افسوس ایسا ہو نہ سکا۔ بالآخر بھری محفل میں آپ نے بے باکی سے فرمایا کہ جس مخبر نے فتویٰ کی خبر دی ہے وہ صحیح ہے یہ میرا ہی لکھا ہوا ہے چنانچہ آپ کو کالا پانی کی سزا ہوگئی۔

آپ آزادی کے مرد مجاہد ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پائے مصنف بھی تھے۔ آپ کی درجنوں تصانیف و حواشی ہیں۔ قید خانے کی تنہائی میں آپ نے 'الثورۃ الھندیہ' (باغی ہندوستان) تحریر کی جو انقلاب آزادی کا ایک مستند ترین ماخذ ہے۔ علامہ کی ایک منظوم تصنیف 'قصائد الھند' کو جزیرہ انڈمان (کالا پانی) سے ۱۸۶۰ء میں کوئلہ اور پنسل سے کپڑے پر لکھی ہوئی تحریر بذریعہ مفتی عنایت احمد کاکوروی اپنے فرزند مولانا عبدالحق خیرآبادی کے پاس بحفاظت پہنچایا جس پر مولانا ابوالکلام نے تعارف لکھا اور جسے مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی نے ۱۹۴۶ء کو ترجمہ کر کے شائع کیا۔ بعد ازاں مجمع الاسلامی مبارکپور سے حواشی اور بعض اہم مضامین کے اضافے کے ساتھ ''باغی ہندوستان'' کی اشاعت عمل میں آئی۔

ایک روز آپ کے صاحبزادے اور معتقدین رہائی کا پروانہ لے کر کالا پانی پہنچے تو ایک جنازے پر نظر پڑی، معلوم ہوا کہ وہ کسی اور کا جنازہ نہیں بلکہ علامہ فضل حق خیرآبادی کا جنازہ ہے جن کا انتقال ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو ہو گیا تھا۔ اب سپرد خاک کرنے جا رہے ہیں۔ ان کی صاحبزادی اور معتقدین حسرت و یاس کے عالم میں شریک دفن ہوئے اور بے نیل مرام واپس لوٹے:

قسمت کی بدنصیبی! کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

آپ پر کئے گئے ظلم و جبر کی داستان کو اپنی تصنیف 'باغی ہندوستان' میں اس طرح بیان کیا ہے:

''دشمن کے ظلم و ستم نے مجھے دریائے شور کے کنارے ایک بلند و مضبوط، ناموافق ہوا والے پہاڑ پر پہنچا دیا جہاں سورج ہمیشہ سر پر رہتا تھا۔ اس میں دشوار گزار راہیں اور گھاٹیاں تھیں، جنھیں دریائے شور کی نہریں ڈھانپ لیتی تھیں، اس کی نسیم صبح بھی گرم و تیز ہوا سے زیادہ سخت اور اس کی نعمت زہر ہلاہل سے زیادہ مضر تھی۔ اس کی غذا حنظل سے زیادہ کڑوی، اس کا پانی سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں ۔۔۔۔۔ ہوا بدبو دار اور بیماریوں کا مخزن تھی۔ مرض سستا اور دوا گراں۔ بیماریاں بے شمار، خارش و قوبا (وہ مرض جس سے بدن کی کھال پھٹنے اور چھلنے لگتی ہے) عام تھی ۔۔۔۔۔ یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے۔ بخار موت کا پیغام، مرض سرسام اور برسام (دماغ کے پردوں کا ورم) ہلاکت کی علت تام ہے۔ بہت مرض ایسے ہیں جن کا کتب طب میں نام و نشان نہیں۔ نصرانی ماہر طبیب مریضوں کی آنتوں کو تنور کی طرح جلاتا اور مریض کی حفاظت نہ کرتے ہوئے آگ کا قبہ اس کے اوپر بناتا ہے۔ مرض نہ پہچانتے ہوئے دوا پلا کر موت کے منہ کے قریب پہنچا دیتا تھا۔ جب کوئی ان میں سے مر جاتا ہے تو نجس و ناپاک خاکروب جو درحقیقت شیطان خناس یا دیو ہوتا ہے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہوا غسل و کفن کے بغیر اس کے کپڑے اتار کر ریت کے تودے میں دبا دیتا ہے۔ نہ اس کی قبر کھودی جاتی ہے، نہ نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ اگر مسلمان کی خودکشی مذہب میں ممنوع اور قیامت کے دن عذاب و عتاب کا باعث نہ ہوتی تو کوئی بھی یہاں قید و مجبور بنا کر تکلیف مالایطاق نہ دیا جا سکتا اور مصیبت سے نجات پا لینا بڑا آسان ہوتا''۔

(باغی ہندوستان، ص ۷۹)

۳) علامہ فیض احمد رسوا بدایونی: علامہ فیض رسوا بدایونی بن حکیم غلام احمد کی ولادت ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء میں بدایوں میں ہوئی۔ محض تین سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ کے زیر سایہ تعلیم پا کر عالم و فاضل ہوئے۔ چودہ سال کی قلیل عمر میں علوم و نقلیہ و عقلیہ سے فارغ ہو کر درس و تدریس کا کام شروع کیا۔ شاعری کا اعلیٰ ذوق تھا اور رسوا تخلص اختیار کرتے تھے۔ بعد ازاں آپ سلسلہ تدریس آگرہ میں پیش کار اور پھر بورڈ آف ریونیو میں سر رشتہ دار مقرر ہوئے۔ ثروت و وقار کے باوجود موصوف کا دل فقیرانہ اور مزاج شاہانہ تھا۔ سر ولیم میور جیسی شخصیت نے آپ سے عربی سیکھی۔ ہندوستان میں جس دن ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام عمل میں آیا اسی دن سے اسلام کے دشمن ہمارے مذہبی عقائد کو مسخ کرنے میں لگ گئے نیز مذہبی کتابوں اور رسائل کی اشاعت کے ذریعے ہندوستانیوں کے رجحانات و عقائد کو سلب کرنے کی کوشش کی گئی۔ الغرض یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائیوں نے ہندوستان میں اسلام کے خلاف زبردست مہم جاری کر رکھی تھی۔ اسی مشن کے تحت ایک پادری فنڈر (Fonder.Revd C.C.D) یورپ سے ہندوستان آیا۔ آگرہ کو اپنا مرکز بنایا اور اپنی دل شکن تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نے مشاہیر علماء کو مناظرہ کا چیلینج دیا۔ ۱۰/اپریل ۱۸۵۴ء میں آگرہ میں مناظرہ کا پہلا اجلاس ہوا۔ جس میں اہل اسلام کی جانب سے مولانا رحمت اللہ کیرانوی مناظر اول اور ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی مناظر دوم تھے اور مولانا فیض احمد بدایونی ان کے معاون و مددگار تھے۔ مسلسل تین دن تک مناظرہ چلتا رہا اور بالآخر اس تاریخی مناظرے میں پادری فنڈر نے شکست کھائی اور آگرہ سے راہِ فرار اختیار کر سیدھا یورپ پہنچا جس میں مولانا فیض احمد بدایونی کا ایک اہم کردار تھا۔

مولانا فیض احمد بدایونی کئی کتب و رسائل کے مصنف و مؤلف نگار تھے۔ مگر ان میں بیشتر کے مسودات انقلاب ۱۸۵۷ء کی افراتفری میں ضائع ہو گئے۔ آپ کی تحریری یادگار میں 'تعلیم الجاہل' مطبوعہ ۱۲۶۹ھ، 'المقامتہ البغدادیتہ (منثور)' 'وھدیہ قادریہ (منظوم)' مطبوعہ ۱۳۰۳ھ اہم ہیں۔

میرٹھ اور دہلی میں جب الم انقلاب بلند ہوا تو اس کا فوری اثر آگرہ پر پڑنا لازم تھا چونکہ آگرہ صوبائی حکومت کا مرکز تھا۔ یہاں مجاہدین فوج کی سرپرستی ڈاکٹر وزیر خاں اور فیض احمد بدایونی نے کی اور جنرل بخت خاں کے ساتھ دونوں سرپرستوں نے فتوائے جہاد تشہیر کی جس پر مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، مفتی فضل کریم اور مولوی عبدالقادر جیسے مرد مجاہدین کے دستخط تھے۔ مذکورہ بالا حضرات اور فتویٰ جہاد کی تشہیر نے بدایوں اور اس مضافات کے ہزاروں افراد نے جنگ آزادی میں حصہ لیا۔

(انسائکلو پیڈیا آف بدایوں، جلد ۲، ص ۱۳۔ بحوالہ: چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء، ص ۸۸)

موصوف انقلاب ۱۸۵۷ء میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ دہلی پہنچے اور یہاں جاری جنگ میں کھل کر حصہ لیا۔ کچھ دن تک شہزادہ مرزا مغل فرزند بہادر شاہ ظفر کے پیش کار رہے بعد ازاں جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جنرل بخت خاں روہیلہ کے ساتھ واپس لوٹ گئے۔ اس کے بعد لکرالہ (بدایوں)، بریلی لکھنؤ اور شاہجہاں پور جیسے منفرد مقامات پر جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ بالآخر جب مولانا مدراسی نے شاہجہاں پور میں اپنی حکومت قائم کی۔ ان کی وزارت میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد آپ کا کوئی ذکر منظر عام پر نہیں آیا۔ جنگ آزادی کا یہ روشن ستارہ تاریکی میں کہیں گم ہو گیا۔

آپ کی زندگی کے آخری ایام کے متعلق پروفیسر محمد ایوب قادری رقمطراز ہیں کہ:

''احمد اللہ شاہ صاحب کی شہادت کے بعد سرکردہ مجاہدین منتشر ہو گئے۔ کانپور، فرخ آباد، مراد آباد، بدایوں، بریلی اور شاہجہاں پور وغیرہ پر مکمل طور پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ مخبروں کی بن آئی تھی ۔۔۔۔۔ فیروز شاہ شہزادہ اور ڈاکٹر وزیر خاں مکہ معظمہ پہنچے۔ مولانا فیض احمد کے متعلق مشہور ہے کہ نیپال کی طرف چلے گئے''۔

(جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد: مولانا فیض احمد بدایونی، ص ۵۳)

۴) مولانا سید کفایت علی کافی: مولانا کافی مراد آبادی ایک بہترین عالم و فاضل اور طبیب و شاعر

تھے۔شاہ ابوسعید مجددی رامپوری سے درس حاصل کیا اور مشہور شاعر ذکی مرادآبادی (شاگرد امام بخش ناسخ) سے شاعری میں شرف تلمذ حاصل کیا۔ ۱۸۴۱ء میں حج و زیارت کی سعادت حاصل کی جس کی یادگار ان کی ایک تصنیف ''تجمل دربار رحمت'' ہے۔علاوہ ازیں آپ کی کئی اہم تصانیف ہیں جن میں:- ترجمہ شمائل ترمذی (منظوم)، مجموعہ چہل حدیث (منظوم) مع تشریح، خیابان فردوس، بہار خلد، نسیم جنت، مولود بہار، جذبہ عشق اور دیوان کافی مشہور ہیں۔

مولانا سید کفایت علی کافی مرادآبادی ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں انگریزوں کے خلاف سینہ سپر تھے اور مرادآباد میں جاری تحریک آزادی کے قائدین میں سرفہرست تھے۔جب مرادآباد میں نواب مجدالدین خاں عرف مجو خاں کی سرکردگی میں آزاد حکومت قائم ہوئی تو آپ کو صدرالشریعہ بنایا گیا۔آپ شرعی احکام کے مطابق مقدمات کے فیصلے سناتے تھے۔موصوف نے مرادآباد سے ہی انگریزوں کے خلاف فتوائے جہاد جاری کیا اور اس کی نقلیں دوسرے مقامات پر بھجوائیں اور بعض مقامات پر آپ خود تشریف لے گئے۔آپ نے آنولہ کی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا۔

مرادآباد میں ہنگامے سے ڈر کر جب انگریز میرٹھ اور نینی تال فرار ہو گئے تب حالات کے پیش نظر علمائے اسلام نے فوری انتظامات کے لئے ایک جنگی مشاورتی کمیٹی قائم کی جو کہ شہر کا انتظام بھی دیکھے گی اور جنگ کے ذرائع و وسائل بھی فراہم کرے گی۔موصوف اس کمیٹی کے اہم رکن تھے۔مگر افسوس ایک غیر منظم جہاد کو ناکام بنانے میں نواب رامپور اور کچھ مقامی غداروں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔جس کے سبب مجاہدین کو زبردست جانی و مالی نقصانات اٹھانے پڑے۔کچھ غداروں کی مدد سے انگریز دوبارہ ۲۴ اپریل ۱۸۵۸ء کو شہر مرادآباد پر قابض ہو گئے۔انگریزوں نے بڑی بے دردی سے نواب مجو خاں کو شہید کر دیا۔اور پھر عیسائی تہذیب کا وہ ننگا ناچ شروع کیا جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

ملک کے غداروں کی مخبری کے سبب کئی مجاہدین کو گرفتار کر پھانسی دے دی گئی۔مولانا کافی کی مخبری ایک کمینہ صفت انسان فخرالدین کلال نے اس بنا پر کر دی کہ انگریز حکومت کے قول کے مطابق مجاہدین کی جائداد کا بڑا حصہ انھیں دیا جائیگا۔ ۳۰ اپریل کو مولانا کو گرفتار کیا گیا اور فوراً مقدمے کی کاروائی شروع ہو گئی۔انگریز عدالت میں ملزم کو اپنی صفائی پیش کرنے کا بھی موقع نہیں دیا جاتا تھا۔مولانا کفایت علی کافی کا مقدمہ ایک انگریز ظالم و جابر مجسٹریٹ کے روبرو پیش ہوا اور بہت جلد فیصلہ سنا دیا گیا۔

(اخبار الصنادید بحوالہ: چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء ص ۹۶)

مولانا عبدالمالک مصباحی رقمطراز ہیں کہ:

۵) دلاور جنگ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی: احمد علی نام ضیاء الدین لقب اور دلاور جنگ خطاب تھا۔آپ کا تعلق گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان سے تھا۔مولانا شاہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے سالار اعظم تھے۔عہد شباب میں ہی آپ پر فکر و تصوف کا غلبہ ہوا اور ریاضت و مجاہدہ کے لئے گھر کو ترک کر دیا۔بعد ازاں گوالیار میں محراب شاہ قلندر گوالیاری کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس حکم کے ساتھ آپ کو محراب شاہ نے اجازت و خلافت دی کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے ہر حال میں آزاد کرانا ہے۔چنانچہ اپنے پیر و مرشد کے وعدے کی تکمیل کے ارادے سے دہلی کے مشاہیر علماء و مشائخ سے ملاقات و گفتگو کی۔مفتی صدرالدین آزردہ کے مشورے پر آگرہ تشریف لے گئے اور یہاں پہنچ کر دینی و علمی شخصیات اور سربرآوردہ حضرات سے رابطہ کیا اور ''مجلس علماء آگرہ'' قائم کی اور علماء کو مربوط و منظم کیا۔

آپ کے وعظ و بیان میں ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا۔جس کا چرچہ ہر طرف عام تھا۔بڑے بڑے علماء و فضلا اور ادبا و شعرا آپ کے گرویدہ ہو گئے۔آپ کے عزائم اور ہر دل عزیزی نے حکومت وقت کو چونکا دیا اور انگریز مخالف سرگرمیوں نے سرکاری کارندوں کے ہوش اڑا دئے۔لہٰذا آپ کو نظر بند کر دیا گیا۔انقلاب ۱۸۵۷ء رونما ہوا اور جیل ٹوٹی تو آپ رہا ہو کر مع محبان وطن کے لکھنؤ آئے اور اپنا اقتدار بڑھانا شروع کیا اور دہلی، آگرہ، میرٹھ، پٹنہ و کلکتہ کے بھی دورے کئے اور انگریزوں کے خلاف مہم کا دائرہ وسیع کر لیا۔

مفتی انتظام اللہ شاہی اکبرآبادی اپنی کتاب 'ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء' میں لکھتے ہیں کہ:

''مولوی احمد اللہ شاہ ہفتے میں تیسرے دن بعد نماز عصر قلعہ اکبرآباد کے میدان میں مردوں کو لے جا کر فن سپاہ گری اور شہ سواری کی مشق کرایا کرتے اور خود بھی ایسا نشانہ لگاتے جس کا جواب نہ تھا۔تلوار کے ہاتھ ایسے جچے تلے ہوتے تھے جس کی دھوم تھی۔۔۔۔جامع مسجد میں آپ کے زمانے میں جتنے آدمی جمع ہو گئے اتنے دیکھنے میں نہیں آئے''۔

(مرجع سابق ص ۱۰۷)

مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی جب شاہجہاں پور پہنچے تو ایک غدار راجہ بلدیو سنگھ نے ۱۸۵۸ء میں ۵۰ ہزار روپے کے لالچ میں آپ کا سر تن سے جدا کر دیا۔عرصہ دراز تک آپ کا سر مبارک شاہ جہاں پور کوتوالی میں لٹکا رہا اور جسم کو آگ کے حوالے کر دیا۔مولانا مدراسی کی شہادت کے ساتھ ہی انقلاب ۱۸۵۷ء کا یہ باب ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

۶) مفتی عنایت احمد کاکوروی: جنگ آزادی کے فراموش کر دئے گئے مرد مجاہدین میں مفتی عنایت احمد کاکوروی کا نام قابل ذکر ہیں۔آپ ۱۸۶۳ء میں دیوہ (بارہ بنکی اودھ) میں پیدا ہوئے۔اپنے والد کے ساتھ کاکوری لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد رامپور سے مختلف علوم و فنون کی تعلیم لی۔علی گڑھ میں مدرس اور مفتی کے عہدے پر فائز ہوئے۔سرکاری ملازمت بھی کی۔علی گڑھ اور اٹاوہ میں منصف رہے پھر صدر امین بن کر بریلی گئے۔قیام بریلی کے دوران اصلاحی اور تبلیغی انجمن 'جلسہ تائید دین متین' قائم کر کے لٹریچر کی نشر و اشاعت کی۔یہ برصغیر کی پہلی اصلاحی انجمن تھی۔ ۱۸۵۷ء میں آپ کو صدرالصدور (آگرہ) بنایا گیا۔سفر کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ مئی میں انقلاب برپا ہو گیا۔موصوف آگرہ نہ جا کر بریلی اور رامپور میں انقلابیوں کے ہمنوا و معاون حتیٰ کے سرپرست کی حیثیت سے سرگرم ہو گئے۔

مجاہدین کے لئے مالی تعاون اور انگریزوں کے خلاف جہاد پر مشتمل ایک فتویٰ بریلی سے جاری ہوا جس پر مفتی عنایت احمد کے دستخط تھے۔پروفیسر محمد ایوب 'جنگ آزادی ۱۸۵۷ء' میں لکھتے ہیں کہ:

''انقلاب سے پہلے بریلی میں اس تحریک کے دو ممتاز کارکن موجود تھے۔مولوی سرفراز علی اور مفتی عنایت احمد کاکوری''۔

(مرجع سابق ص ۱۱۸)

انقلاب کی چنگاری بجھنے کے بعد انگریز حکومت نے فتویٰ جہاد کے الزام میں مفتی عنایت احمد پر مقدمہ چلایا اور اس وقت کے عام دستور کے مطابق کچھ رسمی نمائش اور عدالتی کاروائی کر کے آپ کو جزیرۂ انڈمان (کالاپانی) کی سزا دی گئی۔جہاں آپ نے تقریباً چار سال تک ایام اسیری کی مشقتیں جھیلیں۔ایک انگریز نے تصنیف 'تقویم البلدان' کے ترجمہ کی خواہش ظاہر کی جسے آپ نے قبول فرمایا اور دو سال کی مدت میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔یہی علمی کاوش آپ کی رہائی کا سبب بنی اور ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء کو جزیرۂ انڈمان سے رہا ہو کر ہندوستان واپس آئے۔

جزیرۂ انڈمان میں مفتی عنایت احمد کاکوروی اور علامہ فضل حق خیرآبادی کی تاریخی و علمی خدمات کے متعلق مولانا عبدالشاہد شیروانی رقمطراز ہیں کہ:

''علامہ (فضل حق) جزیرۂ انڈمان پہنچے۔مفتی عنایت احمد کاکوروی صدرامین بریلوی و کول مفتی مظہر کریم دریابادی اور دوسرے مجاہدین علماء وہاں پہنچے۔ان علماء کی برکت سے جزیرہ دارالعلوم بن گیا تھا۔ان حضرات نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ وہاں بھی قائم رکھا۔خرابی آب و ہوا، تکالیف شاقہ و جدا احباب کے باوجود علمی مشاغل جاری رہے''۔

(باغی ہندوستان۔ص ۲۲۵)

جزیرۂ انڈمان میں موصوف نے سیرت النبی پر ایک مختصر کتاب 'تواریخ حبیب الٰہ' اور فن صرف کی کتاب 'علم الصیغہ (فارسی)' تحریر کی جو آج بھی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مندرجہ بالا تصانیف مراجعت کتب کے بغیر محض اپنے قوت حافظہ کی مدد سے قلمبند کی گئی۔ علاوہ ازیں آپ کی تحریر کردہ تقریباً دو درجن کتابیں موجود ہیں۔

۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں رہائی کے بعد کانپور میں دینی و علمی درس و تدریس میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ حج و زیارت حرمین شریفین کی نیت سے آپ اور آپ کا پورا قافلہ حجاز مقدس کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اثنائے سفر میں ایک سخت چٹان سے آپ کا جہاز ٹکرایا اور شدت ضرب سے پاش پاش ہو گیا۔ باون سال کی عمر میں ۱۷ شوال کو ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں آپ مع قافلۂ حجاز شہید اور غریق رحمت ہو گئے۔

۷) مولانا رحمت اللہ کیرانوی: ردِنصرانیت کے ماہر مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے ۱۸۱۷ء میں ایک علمی خاندان میں آنکھیں کھولی۔ آپ نے اپنی زندگی کے سب سے اہم مرحلے میں انگریزوں کے خلاف جد و جہد اور انقلاب ۱۸۵۷ء میں مخلصانہ کردار ادا کیا اور زمین و جائداد کی قربانی دی ہے۔ مولانا امام بخش صہبائی سے بھی تحصیل علم کیا۔ مشنری اسکولوں اور پادریوں کی سرگرمیاں جب بڑھنے لگیں تو آپ نے شاہ عبدالغنی کے حکم پر ایک ضخیم کتاب 'ازالۃ الاوھام' لکھ کر عیسائیوں بالخصوص پادری فنڈر کی لکھی ہوئی کتاب 'میزان الحق' کا دنداں شکن جواب دیا۔

مولانا کیرانوی کا دہلی کے علمی طبقے اور شہزادوں سے گہرے مراسم تھے۔ اس لئے بادشاہ وقت بہادر شاہ ظفر اور دوسرے مجاہدین کے ساتھ مولانا رحمت اللہ نے جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ نیز ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی اور مولانا فیض احمد بدایونی کے ساتھ دہلی کی جنگ آزادی میں شرکت کی۔

مولانا کی اہم تصانیف میں آثار رحمت، تاریخ عروج عہد انگلشیہ اور روز نامچہ عبداللطیف میں آپ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان مجاہدانہ سرگرمیوں کے سبب انگریز سرکار نے آپ کے خلاف مقدمہ چلایا اور گرفتار کروانے والے کو ایک ہزار روپے کا انعام دینے کا اعلان کروایا۔ مگر اس مردِ مجاہد کو گرفتار نہ کیا جا سکا اور آپ کسی طرح مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ آپ کی تمام جائداد ضبط کر کے نیلام کر دی گئی۔ مکہ مکرمہ میں موصوف نے ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں مدرسہ صولتیہ قائم کیا اور درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ سلطان ترکی کی دعوت پر آپ نے کئی بار قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ انھیں کی خواہش پر آپ نے ردِنصرانیت میں اپنی معرکۃ الآرا کتاب 'اظہار الحق' قلمبند کر کے پادریوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ ۲۴ رمضان ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں مکہ مکرمہ کی مقدس زمین پر آپ کا انتقال ہوا اور جنت المعلیٰ میں تدفین ہوئے۔

۸) مولانا ڈاکٹر وزیر علی خاں اکبرآبادی: حریت نواز مولانا ڈاکٹر وزیر علی خاں اکبرآبادی کا تعلق صوبہ بہار سے تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد والد نے مرشدآباد (بنگال) میں انگریزی تعلیم دلائی اور پھر انگلینڈ بھیج دیے گئے جہاں آپ نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ یونانی و عبرانی زبانیں سیکھیں اور انجیل و توریت کا گہرا مطالعہ کیا۔ وطن واپسی کے بعد کلکتہ کے ایک اسپتال میں حکومت کی جانب سے اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوئے۔ اس کے بعد آگرہ آ گئے۔ یہاں مفتی انعام اللہ سے ربط و ضبط ہوا اور جب مولانا احمد اللہ مدراسی نے مجلس علماء آگرہ بنا کر اپنی سرگرمی شروع کی تو آپ ان کے دست و بازو بن گئے۔ ڈاکٹر وزیر علی خاں کے متعلق مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی 'غدر کے چند علماء' میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "ڈاکٹر وزیر خاں کو انگریز دشمنی اور حریت نواز کا چسکا شاہ صاحب (احمد اللہ شاہ مدراسی) کے فیض صحبت سے پڑا...... ۱۸۵۴ء میں پادری فنڈر سے آگرہ میں تین دن تک مناظرہ ہوا جس میں آپ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے معاون تھے۔"

(چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء ص ۱۴۲-۱۴۵)

آگرہ میں جو فوج فدائیوں کی آئی اس کی سرپرستی ڈاکٹر وزیر علی خاں نے کی بعد میں ڈاکٹر صاحب جنرل بخت خاں کی فوج میں شامل ہو گئے۔ جنرل صاحب نے انگریزی فوج کو جہاں مقابلہ ہوا وہاں شکست دی۔ لیکن مرزا مغل کی کمزوری سے اور کم اندیشی کے سبب مجاہدین کو ہار کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور مقبرۂ ہمایوں سے بہادر شاہ ظفر گرفتار کر لئے گئے۔

دہلی میں شکست کے بعد جنرل بخت خاں روہیلہ، ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی اور مولانا فیض احمد بدایونی وغیرہ اپنی فوج کے ساتھ لکھنؤ واپس چلے گئے۔ لکھنؤ میں احمد اللہ شاہ مدراسی کے ساتھ انگریزوں کے خلاف مورچہ بندی کی پھر شاہجہاں پور جانا پڑا لیکن وہاں بھی ناکامی کے سبب منتشر ہو کر اکثر حضرات نیپال چلے گئے۔ ڈاکٹر وزیر علی خاں مکۂ مکرمہ پہنچے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ مکہ مکرمہ میں ڈاکٹر صاحب چودہ سال تک بقید حیات رہے۔ وہیں ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۳ء میں آپ کا انتقال ہوا اور جنت المعلیٰ میں تدفین ہوئی۔

۹) مولانا وہاج الدین مرادآبادی: بے باک مجاہد مولانا وہاج الدین دینی جذبہ اور قوم پروری میں بے مثال تھے۔ حکام شہر آپ کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عوام و خواص میں آپ یکساں مقبول تھے۔ عربی و فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی آپ کو قدرت رکھتے تھے۔ مرادآباد میں ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں آپ نے نمایاں کردار ادا کیا اور ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو مرادآباد جیل خانہ پر آپ نے ایک ہجوم کے ساتھ حملہ کیا اور سارے قیدیوں کو آزاد کرا لیا۔

مولانا وہاج الدین نے رامپور کا دورہ کیا اور وہاں بھی انگریزوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا۔ نواب رامپور یوسف علی خاں انگریزوں کے وفادار تھے بغیر اس کی پرواہ کئے حب الوطنی کا جذبہ لئے بے خوف و خطر میدان میں کود پڑے اور رامپور کے گردونواح میں جلسے کرتے اور اپنی تقاریر کے ذریعے عوام کو بیدار کر کے جنگ آزادی کی تحریک میں شمولیت کی دعوت دیتے۔ شہزادہ فیروز شاہ کی سرپرستی میں مولانا کفایت علی کافی اور مولانا وہاج الدین نے مل جل کر مرادآباد میں انقلاب برپا کر دیا۔ انقلاب کی ناکامی کے بعد ایک مخبر کی غداری کے باعث عصر و مغرب کے درمیان رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۸ء میں آپ پر حملہ کر دیا اور گھر کے اندر ہی گولی مار کر شہید کر دیا۔

۱۰) مولانا امام بخش صہبائی دہلوی: مولانا امام بخش صہبائی ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور والدہ کی جانب سے سیدنا غوث اعظم رحمت اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ امام بخش کو فن معمہ میں قدرت حاصل تھی اسی لئے انھیں معمائی بھی کہا جاتا تھا۔ آپ نے تین بادشاہوں شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی، اور بہادر شاہ ظفر کا زمانہ دیکھا۔ مولانا صہبائی اپنے زمانے کے مشہور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ سرسید احمد خاں نے اپنی مشہور و معروف کتاب 'آثار الصنادید' کی ترتیب میں موصوف سے مدد بھی لی تھی۔ جس کا اعتراف کرتے ہوئے سرسید احمد خاں نے اپنی کتاب میں بڑی تفصیل بیان کی ہے۔

'یادگار غالبؔ' میں الطاف حسین حالیؔ نے لکھا ہے کہ:

> "صہبائی کی نظم و نثر اور دیگر رسائل اور شرح تین جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں"۔

(یادگار غالبؔ۔ ص ۲۳)

امام بخش صہبائی کی عظمت و مقبولیت کا اندازہ اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے جس میں مرزا غالبؔ نے اپنے معاصرین شعراء کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

مومن و نیر و صہبائی و علوی و انگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاہ

مولانا امام بخش صہبائی فارسی کے ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب طرز انشاء پرداز، دقیقہ رس شارح اور نکتہ بیں محقق کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزردہؔ ،مولانا فضل حق خیر آبادی، غالبؔ اور شیفتہؔ جیسے باکمال شاعر آپ کی فارسی دانی کے قائل تھے۔ مرزا غالبؔ اور صہبائی میں گہرے مراسم تھے۔ مولانا صہبائی انگریز مخالف ذہن رکھنے کے ساتھ ساتھ انقلابیوں اور مجاہدوں کے ہمدرد و نوا تھے اور قلعۂ معلہ کی مجلسوں اور بعض مشوروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزی فوج نے موصوف کے محلہ کوچہ چیلان دہلی سے تقریباً چودہ سو افراد کو گرفتار کر کے راج گھاٹ جمنا کنارے اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا جن میں مولانا صہبائی بھی تھے۔ نیز آپ کے گھر کے اکیس افراد شہید کر دیئے گئے۔ مولانا صہبائی کے بھانجے مولانا قادری اس قتل عام کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہر پرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دن دن کرتے آ پہنچے۔ پہلی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔۔۔۔ پھانسیوں کی بجائے باغی گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے۔ مسلح سپاہیوں نے اپنی بندوقیں تیار کیں۔ ہم تیس چالیس آدمی ان کے سامنے کھڑے تھے کہ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آ کر کہا کہ موت تمہارے سر پر ہے گولیاں تمہارے سامنے ہیں اور دریا تمہاری پشت پر ہے۔ تم میں جو لوگ تیرنا جانتے ہیں وہ دریا میں کود پڑیں۔ میں بہت اچھا تیراک تھا مگر ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائی اور ان کے صاحبزادے مولانا سوزؔ، تیرنا نہیں جانتے تھے۔ اس لئے دل نے گوارا نہ کیا کہ ان کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا اس لئے میں دریا میں کود پڑا۔ پچاس یا ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کانوں میں آئیں اور صف بستہ لوگ گر کر مر گئے''۔

اس المناک شہادت کی خبر سن کر مفتی آزردہ کا دل تڑپ اٹھا اور بے اختیار زبان سے صدا آئی۔

کیوں کر آزردہؔ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

اکبر آبادی فرماتے ہیں۔

نوجوانوں کو ہوئیں پھانسیاں بے جرم و قصور
مار دیں گولیاں پایا جسے کچھ زور آور
وہی صہبائی جو تھے صاحب قول فیصل
ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر

تفصیل سے قطع نظر کہا جا سکتا ہے کہ آزادی کی پوری تاریخ علماء کی قربانیوں سے بھری پڑی ہے۔ ملک کی آزادی کی خاطر ہمارے اسلاف نے جو خون کے دریا بہائے ہیں اس کا کہیں ذکر نہیں کیا جاتا ہے۔ میدان جنگ میں جب بھی تیر و سنان کے مقابلے کی ضرورت پیش آئی ہے تو ہمارے علماء نے اپنا سینہ پیش کیا ہے مگر افسوس کہ کوئی نام نہاد مورخ علماء کی خدمات اور قربانیوں کو نظر انداز کرتا ہے اور تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اس کی بدبختی ہے وہ تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں کر رہا ہے بلکہ ظلم کر رہا ہے۔

اک اک نفس میں بوئے وطن ہے بسی ہوئی
نبض وطن میں خون کی صورت رواں ہیں ہم

❑❑❑

غزل

جو تپش سے ہجر کی رنجور تھا
وصل ہونے پر وہ مثل طور تھا

آدھی مزدوری پہ تھا مزدور خوش
اس کے بچے بھوکے تھے، مجبور تھا

ان کے آنسو پونچھتا میں کس طرح
بھائی میں تو ان سے کوسوں دور تھا

ظلمتیں آتی نہ تھیں میرے قریب
میں تیرے جلووں سے جب معمور تھا

عیش و عشرت میں گیا صبر و قرار
تھی سہولت کم تو میں مسرور تھا

گرد تھا میرے انا کا دائرہ
میں بھی اس کمبخت میں محصور تھا

جو بھی اُس کا فیصلہ تھا اے جمیلؔ
وہ مجھے تسلیم تھا، منظور تھا

جمیل احمد جمیلؔ
دین دیال روڈ اشرف آباد، لکھنؤ
9415780888

ڈاکٹر عبدالسمیع

محلہ۔آلوتھوک ٹلیا،ہردوئی

9170389242

تحریکِ آزادی میں غیر مسلم صحافیوں کی خدمات

آزادی ایک نعمت ہے قدرت نے انسان کی فطرت میں آزاد رہنے کا مادہ رکھا ہے۔انسان تو انسان حیوان، چرند و پرند بھی قید و بند اور غلامی و پابندی کو پسند نہیں کرتے ،موقع ملتے ہی آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ہمارا جنت نشان ملک ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد مکمل طور پر انگریزی سامراج کے زیر تسلط آگیا انگریزوں نے معاشی استحصال کے ساتھ ہی یہاں کی صدیوں پرانی سماجی، اخلاقی اور تہذیبی قدروں کو بھی متاثر کیا۔انگریزوں کا تسلط اور ظلم و جبر ہندوستانیوں کے لیے باعثِ عار تھا۔ہندوستان کی عوام نے مل جل کر اپنے ملک کی آزادی کے لیے تحریک چلائی ،تحریک آزادی اور اردو صحافت کا تعلق و رشتہ بہت مضبوط رہا ہے۔اردو ہندو مسلم کی مشترکہ زبان ہے اردو صحافت میں غیر مسلم صحافی بھی مسلموں کے شانہ بشانہ تھے تحریک آزادی میں اردو صحافت کے ذریعہ غیر مسلم صحافیوں نے بھی اہم رول نبھایا ہے۔عموماً اردو صحافت کا تذکرہ ہو یا تحریک آزادی کے سلسلہ میں اردو صحافت کا کردار ہو غیر مسلم صحافیوں کی خدمات کا ذکر پسِ پشت رہ جاتا ہے حالانکہ ان کی گرانقدر خدمات اس قابل ہیں کہ ان کا ذکر زریں الفاظ میں کیا جائے تاکہ عصرِ حاضر میں اردو کے مخالفین کو یہ باور کرایا جاسکے کہ اردو ہندوستانیوں کی مشترکہ وراثت ہے۔اس کو کسی ایک مذہب یا فرقہ کی زبان قرار دینا ناانصافی اور سراسر ظلم ہے۔اس مضمون میں غیر مسلم صحافیوں کی تحریک آزادی میں خدمات کا ذکر کیا جائے گا۔تحریک آزادی میں اردو صحافت کے کردار کے بارے میں راج نرائن راز لکھتے ہیں:

> ”۱۸۵۷ء کا انقلاب بپا ہوا۔غیر ملکی غلبے سے نجات پانے اور آزادانہ زندگی میں سر اٹھا کر چلنے کی خواہش اور کسی حد تک منظم سعی کا نتیجہ ہندوستان کے لیے مزید خستگی اور خرابی میں ظاہر ہوا۔تاہم آزادی کے حصول کی خواہش چنگاری کی صورت دلوں میں دہک رہی تھی۔علمی اور ذہنی بیداری کا جو عمل شروع ہوا اس نے مزید پچاس برسوں میں تحریک آزادی کی واضح شکل اختیار کیا۔یہ ملک کی سیاسی اور اصلاحی جماعتوں کی ملی جلی مساعی کا ثمرہ تھا۔آزادی کے حصول میں گنگا جمنا تہذیب کی پروردہ زبان اردو کا حصہ قابل قدر ہے۔اس کے بیشتر گوشے آج بھی روشنی کے محتاج ہیں۔تاہم جو کچھ مختلف وسیلوں اور ذرائع سے ہم تک پہونچا ہے وہ اس محترم زبان کو دلوں میں بسانے اور سر آنکھوں پر جگہ دلانے کے لیے کافی ہے۔اس زبان نے تحریک آزادی میں جو رول بیسویں صدی کے آغاز سے ادا کیا وہ ہر اعتبار سے مثبت اور لائق ستائش ہے تاہم جو رول اردو اخبار نے انیسویں صدی کے کرب و انتشار والے زمانے میں براہ راست اور بالواسطہ انجام دیا اس کی اہمیت اس اعتبار سے زیادہ ہے کہ وہی آنے والے زمانہ میں اس کے کردار کی بنیاد بنا۔“ [1]

اردو زبان کی صحافت میں جن غیر مسلم صحافیوں کی خدمات آبِ زر سے لکھی جانے کے قابل ہیں ان میں پہلا نام مشہور سماجی کارکن مصلح راجہ رام موہن رائے کا ہے جنھوں نے سب سے پہلے دیسی اخبار نویسی کی آزادی کی صدا بلند کی۔راجہ رام موہن ایک غیر جانبدار بیباک اور ایماندار صحافی تھے انھوں نے پریس ریگولیشن کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی وہاں سے اپیل مسترد ہونے پر برطانیہ کے شاہ کونسل میں اپیل کی مگر وہاں بھی ناکامی ہاتھ لگی۔انھوں نے اصلاحی کاموں کے ساتھ ساری زندگی حصول آزادیٔ وطن، آزادیٔ پریس کی بحالی کی کوششیں کیں۔اصلاحی کاموں میں ستی رسم کا خاتمہ آپ کی کوششوں سے ہوا۔

مکند لال کے رسالہ کا نام ہی ”تاریخ بغاوت ِہند“ تھا۔حالانکہ مکند لال آگرہ میں اسسٹنٹ سرجن تھے مگر آزادی کی فکر اور انگریزوں کے خلاف بغاوت کے جذبہ نے انھیں اس سے بے نیاز کر دیا تھا کہ اس بغاوت کا انجام کیا ہوگا۔جنگ آزادی کے معرکوں اور خبروں کے لیے ان کا رسالہ مخصوص تھا۔ہندو مسلم کی مشترکہ جدو جہد اور کوششوں کا ذکر اس رسالہ میں بکثرت ملتا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ”سردار امر سنگھ منصور اردو صحافت اور شاعری دونوں میں اہم مقام کے حامل ہیں۔ان کی تحریک آزادی میں کوشش اور جدو جہد اہمیت رکھتی ہے،اردو فارسی اور پنجابی کے ماہر تھے ۔ہفتہ وار اخبار”شیر پنجاب“ کے مدیر تھے۔اس اخبار کا مقصد اولین آزادی ہند کا حصول تھا۔سردار امر سنگھ محب وطن اور اس کی تحریک آزادی کی خاطر سب کچھ لٹا دینے والے لوگوں میں سے تھے،کئی بار جیل بھی گئے مگر جیل کی پریشاں اور صعوبتیں ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ پیدا کرسکیں۔ان کی شاعری بھی آزادی کے نغموں اور مجاہدین آزادی کے لیے جوش و ولولہ سے بھرپور ہوتی تھی۔
>
> لالہ لاجپت رائے بانی ”بندے ماترم“ تحریک آزادی کی اہم شخصیت ہیں۔آپ نے اپنی تقریر و تحریر دونوں کے ذریعہ آزادی کی جدو جہد کی۔بندے ماترم ہندو مسلم دونوں میں نہایت مقبول اخبار تھا اور انگریز حکومت اس کو انتہا پسند اخبار قرار دیتی تھی۔لالہ لاجپت رائے عدم تعاون کے کٹر حامی تھے۔“

”سب ہندو اور مسلمان کو لازم ہے کہ شامل ہو کر بالاتفاق اپنے اپنے مذہبوں کی حمایت کریں اور نوکری کے واسطے حاضر آئیں قاضی وان الدین (وحید الدین) کوتوال شہر مقرر کیا گیا۔ قصابوں کے محلہ کے باشندوں نے مجموعی جھنڈا کھڑا کیا اور بہت سے مسلمان ان جھنڈے میں شامل ہوئے۔“ ۲

نانا صاحب جنھوں نے کانپور میں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی تھی۔ ان کا جنگ آزادی کے لیے تاریخی اعلان ڈاکٹر مکند لال کے اخبار ”تاریخ بغاوت ہند“ میں اشتہار کی شکل میں شائع ہوا تھا۔ یہ اخبار تحریک آزدی کا علمبردار ہونے کے ساتھ فرقہ وارانہ اتحاد کا حامی تھا۔

گھیر نارائن عباس ”سحر سامری“ نامی اخبار کے ایڈیٹر تھے پہلے امیر مینائی اس کے ایڈیٹر رہے تھے۔ گھیر نرائن عباس بیباک صحافی، ایماندار، نڈر اور غیر جانبدار انسان تھے سرکاری کمپنی بہادر پر بے جھجھک اور بلاخوف وخطر تنقید کرتے تھے واجد علی شاہ کے حمایتی تھے۔ اس اخبار کے بارے میں عتیق صدیقی کی رائے ملاحظہ کریں:

”ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو صحافت نے ایثار و قربانی اور عقیدہ و اعتقاد پر ثابت قدمی کی وہ بلندیاں حاصل کی تھیں جن کی مثال ہندوستان یا ہندوستان سے باہر دوسرے ممالک کی انقلابی تحریکوں میں بھی ملنی محال ہے۔ کہا جاتا ہے زار شاہی کے زمانہ میں روس کے دو انقلابی اخباروں پراودا PRAVADA اور اسکرا ISKARA کو زندہ رکھنے کے لیے لینن اور ٹرائسکی اور ان کے سیکڑوں ساتھیوں نے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ اردو صحافت میں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ ایک ایک ایڈیٹوریل کے لیے جسے حاکمان وقت نے باغیانہ قرار دیا، اخبار کے مالک یا ایڈیٹر کو سزائے موت کا سامنا کرنا پڑا یا زندگی بھر تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے انڈیمان کی دوزخی جیل میں جھونک دیا گیا۔“ ۳

بابو کاشی داس متر نے بنارس سے ”آفتاب ہند“ جاری کیا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ ان کو جب بھی انگریز اور انگریزی حکومت کے خلاف لکھنے کا موقع ملتا ضرور لکھتے تھے۔

جمنا پرشاد قومی یکجہتی کے دلدادہ اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی و خواہاں تھے۔ انھوں نے ”شعلہ طور“ اخبار کانپور سے جاری کیا تھا۔ انگریزوں کی ظلم و زیادتی اور ہندوستانی عوام پر اضافی ظالمانہ ٹیکس کی مخالفت میں کھل کر لکھتے تھے۔ حکومت کی بدعنوانیوں اور کاموں پر تنقید کرتے تھے۔ ہندوستانی عوام کی حمایت کرتے ان کے کاموں کی سراہنا کرتے ٹونک میں قحط سالی کے وقت وہاں کے نواب نے عوام کی خوب مدد کی جمنا پرشاد نے نواب کی دریادلی اور فیاضی کی خبر نمایاں طور پر شائع کی۔

”سوراجیہ“ اخبار کے بانی و ایڈیٹر کا نام شانتی نرائن بھٹنا گر تھا۔ سوراجیہ کی اشاعت الہ آباد سے ہوتی تھی۔ شانتی نرائن ہندوستانیوں کو انگریزوں سے بغاوت پر ابھارتے تھے انھیں اس جرم کی پاداش میں جیل بھی جانا پڑا۔ مہاشہ خوشحال چندر خورشید ”ملاپ“ کے بانی و ایڈیٹر تھے۔ ملاپ کا ایک ایڈوٹیریل ”بھارت کے خاموش سپاہی“ تھا۔ اس جرم کی وجہ سے جیل جانا پڑا مگر جلد رہا ہو گئے۔ دوسرا مقدمہ خاں عبدالغفار کی خبر شائع کرنے کے سلسلے میں آپ پر قائم ہوا تھا۔ محمد سلیمان صابر اخبار پرتاپ اور محاشہ خوشحال چند کے بارے میں لکھتے ہیں:

جس کے ایڈیٹر و مالک مہاشہ خوشحال چند خورشید تھے، تحریک آزادی کو آگے بڑھانے میں کسی سے پیچھے نہ رہا۔ مہاشہ جی کئی بار گرفتار ہوئے اور دو اخبار کی ضمانت ضبط ہوئی۔ بعد میں ان کے صاجزادے رنبیر جی نے جو ایک انقلابی کارکن تھے، اپنی پرانی روایت کو قائم رکھا اور جب تک زندہ رہے، یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ یہ اخبار آج بھی دہلی سے نکل رہا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اپنی پرانی روش پر قائم ہے۔“ ۴

ہندو حضرات کے دوش بدوش شانہ بشانہ سکھ حضرات نے بھی اردو صحافت کے ذریعہ تحریک آزادی میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ”ریاست“ کا نام اس سلسلہ میں اہمیت کا حامل ہے۔ ”ہمدم“ اور ”رغبت“ میں کام کرنے کے بعد مفتون نے دہلی سے ہفتہ وار ”ریاست“ جاری کیا۔ مفتون صاحب غیر جانبداری، آزادی رائے اور بے لاگ تبصروں کے لیے مشہور تھے۔ انگریزوں کی مخالفت کے ساتھ ہی مطلق العنان اور ظالم و جابر ہندوستانی رئیسوں، جاگیرداروں کے ظلم و جبر اور زیادتیوں کے خلاف بھی لکھتے تھے اسی وجہ سے انگریز اور ہندوستانی رؤساء دونوں آپ کے اخبار کو نقصان پہونچانے کی کوشش کرتے تھے، ۱۵ ربار جیل کی ہوا کھائی، ۸ رجیلوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ مگر تحریک آزادی کے مقاصد سے کبھی روگردانی نہیں کی۔ گربچن چندن آپ کی صحافتی خدمات اور آپ کے اخبار ریاست کے بارے میں لکھتے ہیں:

”ریاست اردو صحافت میں روشنی کا ایک مینار تھا اور سردار دیوان سنگھ مفتون اردو صحافت کے ایک ایسے ستون جس پر اردو صحافت کو تا ابد ناز رہے گا۔ سردار صاحب نے صحافت کو ہمیشہ ایک بلند مقام دیا کہ ہر صحافی اپنی ذاتی اغراض سے بلند رہ کر ملک و قوم کی خدمت کرے“ ۵

سردار امر سنگھ منصور اردو صحافت اور شاعری دونوں میں اہم مقام کے حامل ہیں۔ ان کی تحریک آزادی میں کوشش اور جدو جہد اہمیت رکھتی ہے، اردو فارسی اور پنجابی کے ماہر تھے۔ ہفتہ وار اخبار ”شیر پنجاب“ کے مدیر تھے۔ اس اخبار کا مقصد اولین آزادی ہند کا حصول تھا۔ سردار امر سنگھ محب وطن اور اس کی تحریک آزادی کی خاطر سب کچھ لٹا دینے والے لوگوں میں سے تھے، کئی بار جیل بھی گئے مگر جیل کی پریشاں اور صعوبتیں ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ پیدا کرسکیں۔ ان کی شاعری بھی آزادی کے نغموں اور مجاہدین آزادی کے لیے جوش و ولولہ سے بھرپور ہوتی تھی۔

لالہ لاجپت رائے بانی ”بندے ماترم“ تحریک آزادی کی اہم شخصیت ہیں۔ آپ نے اپنی تقریر و تحریر دونوں کے ذریعہ آزادی کی جدو جہد کی بندے ماترم ہندو مسلم دونوں میں نہایت مقبول اخبار تھا اور انگریز حکومت اس کو انتہا پسند اخبار قرار دیتی تھی۔ لالہ لاجپت رائے عدم تعاون کے کٹر حامی تھے۔ کئی بار آپ کے اخبار پر مقدمے ہوئے ۱۹۲۰ء میں اس اخبار کو بلیک لسٹ میں شامل کیا گیا۔ تحریک آزادی کو ہمہ گیر بنانے اور وسعت عطا کرنے میں لالہ لاجپت رائے اور ان کے اخبار بندے ماترم کی خدمات نہایت زریں ہیں۔ خوشتر گرامی رقمطراز ہیں:

”لالہ جی آتش بیان مقرر تھے ان کی زندگی بھی ہنگامہ خیز رہی اور ان کی موت بھی ہنگامہ ساماں ہوگئی انھوں نے انقلاب اور انقلابیوں کو جنم دیا سچ یہ ہے کہ بھگت سنگھ اور ان کا انقلابی گروہ لالہ جی کی خاک سے پھوٹنے والے انقلاب کا ثمر و بار شجر تھے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تحریک میں لالہ جی لاٹھی چارج میں زخمی ہوئے اور ایک ماہ بعد اس دنیا سے کوچ کر گئے لاٹھی چارج کے بعد لاہوری دروازہ لاہور کے باہر تاریخی جلسہ ہوا جس میں لالہ جی شیر کی طرح دہاڑ رہے تھے انھوں نے اس جلسے میں پیش گوئی کی کہ میری پیٹھ پڑنے والی ایک ایک لاٹھی برطانوی حکومت کے تابوت میں ایک ایک کیل بن کر لگے گی“ ایک ماہ بعد وہ داغ مفارقت دے گئے۔ جس پر بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی طوفان کی طرح اٹھے اور لاہور کے سپرنٹنڈنٹ پولس سانڈرس کو موت کے گھات اتار دیا۔ انھیں بھی پھانسی دے دی گئی لیکن آزادی کا کارواں اپنا پرچم اڑاتا آگے بڑھتا رہا اور پھر انقلاب کی ایسی آندھی چلی کہ ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو یونین جیک آڑا لے گئی۔“ ۶

مہاشہ کرشن نے ایک اخبار ”پرتاپ“ جاری کیا ۱۹۱۹ء میں جب مہاتما گاندھی دہلی میں ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر رہے تھے اس وقت اس کی اشاعت کی ابتدا ہوئی۔ شروع میں میں یہ آزادی کا نقیب تھا۔ مہاشہ کرشن انگریزوں کے خلاف بہت سخت مضامین لکھا کرتے تھے۔ کانگریس کی

تحریک آزادی کا ترجمان پرتاپ کو کہا جاتا ہے مہاشہ کرشن نے جیل کی سزا کاٹی ،حکومت کے مظالم کے خلاف لکھنا مجبور و مقہور عوام کی حمایت کرنا اور مظلوموں کی تکلیفوں و پریشانیوں کو بیان کرنا ان کا مقصد اصلی تھا۔اس مقصد کی خاطر مہاشہ کرشن اپنا سب کچھ لٹانے کے لیے تیار رہتے تھے۔مہاشہ کرشن نے کبھی بھی صحافت کے اصولوں اور اپنی قدروں سے سمجھوتہ نہیں کیا زندگی بھر صداقت،حق بیانی سے کام لیتے رہے تمام دشواریوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے آزادی کے بعد بھی اہل اِقتدار کو ان کا فرضِ منصبی یاد دلاتے رہے اور مہاجرین و بے گھر لوگوں کے مسائل بڑی شدومد سے اٹھاتے رہے مقدمات کا سامنا کیا مگر صحافتی قدروں کا دامن کبھی نہیں چھوڑا ۲۰۱فروری ۱۹۶۳ء کو ۸۴ رسال کی عمر میں انتقال ہوا۔

اجودھیا پرشاد کشمیری برادری سے تعلق رکھتے تھے ''خیر خواہ خلائق'' کے ایڈیٹر تھے۔آزادی کی کوششوں ،ہندوستانیوں کی اسلحہ سے محرومی،ذات پات کے توہمات خیالات وغیرہ موضوع پر لکھتے تھے اس وجہ سے حکومت نے اس اخبار کی آزادانہ روش کو ناپسند کرتے ہوئے اس کی اشاعت پر پابندی لگادی۔منشی اجودھیا پرشاد معتوب ہوئے ان پر مقدمہ چلایا گیا قید کی سزا ہوئی۔

کرشن دیا بے لاگ لکھتے تھے بیباکی،جوانمردی اور پامردی کا مرقع تھے۔آزادیٔ صحافت کے علمبردار اور آزادیٔ ملک کے متوالے تھے۔اردو ہندی دونوں زبانوں میں ''بدیہ بلاس'' اخبار نکالتے تھے۔انگریزوں کے مظالم،بے انصافیوں،بداعمالیوں اور پالیسیوں پر کھل کر لکھتے تھے۔

خوشتر گرامی ''بیسویں صدی'' کے ایڈیٹر تھے پورا نام رام رکھا مل خوشتر تھا۔تنگ حالی اور فقروفاقہ والی زندگی کے باجود ہمیشہ حق کی آواز بلند کرتے رہے،پہلے ''زمیندار''،'' بندے ماترم''،''مزدور'' وغیرہ اخبار میں کام کیا حق گوئی بیباکی ان کا شعار،حق وانصاف،صداقت حق گوئی ان کی عادت تھی مظلوموں ،غریبوں،کمزوروں اور ناداروں کی آواز بلند کرتے تھے۔حکومت کی بدعنوانیوں پر لکھتے اور اربابِ حکومت کے رعب و دبدبہ اور احکام سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے اور ان کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا۔

صوفی امبا پرشاد اخبار ''جامع العلوم'' کے بانی تھے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ انگریز حکومت کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔وہ صاف طور پر کہتے تھے کہ انگریزوں کے قتل سے ہی آزادی مل سکتی ہے،زندگی بھر مقدمات اور قید وبند کا سامنا رہا مگر آپ کی جدو جہد آزادی میں کوئی کمی نہ آئی کئی اخبارات میں باغیانہ مضامین لکھتے تھے فارسی،اردو،ہندی کے بڑے جانکار تھے کئی کتابیں مختلف زبانوں میں لکھیں ملک کی آزادی کی خاطر ایسے مجاہدین کی تشکیل کرتے جو آزادی کی خاطر ہر قربانی دینے اور سب کچھ لٹانے کے لیے تیار رہتے تھے۔آپ کی منظم کوششوں سے انگریز خائف رہتے تھے۔آپ کی وطن عزیز کی آزادی اور انگریزوں کے خلاف جدو جہد کے بارے میں یہ تحریر ملاحظہ فرمائیں:

''مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں کشمیر پر انگریزوں کے قبضہ ہو جانے کا زبردست خطرہ لاحق ہو گیا تھا مجاہدین آزادی کو بھی اس کی خبر مل چکی تھی اس سازش سے متعلق کاغذات غائب کرنے کا مسئلہ تھا جس کے لیے امبا پرشاد ہی نے گونگا بہرا بن کر پولٹیکل ایجنٹ کی ملازمت کرنے کے بہانے کاغذات حاصل کئے اور پولٹیکل ایجنٹ کو خبر تک نہ ہوئی ۔کچھ عرصہ بعد ہندوستان میں اپنے آپ کو خطرے میں دیکھ کر وہ ایران چلے گئے اور وہاں پر '' آب حیات'' نامی اخبار جاری کیا۔کئی بار کوشش کرنے پر انگریز انھیں گرفتار نہ کر پائے لیکن ۱۹۱۵ء میں جب برٹش گورنمنٹ ایران پر قبضہ کرنا چاہتی تھی شیراز کا محاصرہ کرلیا گیا صوفی کا صرف بایاں ہاتھ تھا اسی ہاتھ سے روالور چلا کر مقابلہ کیا لیکن وہ انگریزوں کے ہاتھ آگئے کورٹ مارشل کا حکم ہوا اور گولی سے اڑا دینے کا فیصلہ سنایا گیا۔

دوسرے روز جب آپ کو سزا دینے کے لیے سپاہی لینے گئے تو ایک کمرے میں سمادھی لگائے بیٹھے تھے ان کی روح جسم کو چھوڑ چکی تھی یو پی میں پیدا ہونے والا پنجاب میں حب الوطنی کی شمع روشن کرنے والا ایران میں جاں بحق ہوا۔'' ۷

منشی نول کشور نے ''اودھ'' اخبار جاری کیا گرچہ براہ راست جنگ آزادی میں ان کا کردار کچھ اہم نہیں ہے مگر انگریز حکومت کی بدانتظامیوں،حکمرانوں کی عیاشی وفضول خرچی پر اعتراض اور نکتہ چینی ضرور کرتا تھا سیاسی بیداری کا بگل بھی بجا رکھا تھا انگریزی اخبارات کو آستین کا سانپ قرار دینا،مجاہدین آزادی پر مقدمات،سزاؤں اور کارروائیوں کو اس اخبار میں نمایاں خبر کی شکل میں شائع کیا جاتا تھا۔

سوہن لال اخگر واخبار ''محب وطن'' کے ایڈیٹر تھے ۔یہ اخبار اسم با مسمیٰ تھا عوام کے دلوں میں وطن کی محبت پیدا کرتا تھا۔شاعری ونثر دونوں کے ذریعہ آزادی کا جذبہ بیدار کرتا تھا۔سوہن لال اخگر وآزادی ملک کے خواہشمند تھے۔

ڈاکٹر ستیہ پال ''جے بھارت'' اخبار کے بانی تھے آپ کی گھٹی میں وطن کی محبت پڑی تھی۔تحریک آزادی میں پوری شدومد سے حصہ لینا بار بار جیل جانا قید وبند کی تکلیفیں برداشت کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا،فرقہ پرستی سے انھیں شدید نفرت تھی کبھی مصائب وآلام سے نہیں گھبراتے قومی یکجہتی کے علمبردار تھے کانگریس کے اہم عہدوں پر فائز رہے پنجاب اسمبلی کے اسپیکر تھے اردو زبان میں عمدہ اور سلیس تقریر کرتے تھے،ڈینٹل سرجن تھے تمام شہرت ومال،عہدے مناصب آزادیٔ ملک کی خاطر قربان کردیئے۔آپ کا نام عظیم مجاہدین آزادی اور اردو صحافی کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔

شری رنبیر ''ملاپ'' کے ایڈیٹر تھے بچپن سے ہی بڑے دیش بھگت تھے انقلابی ذہن رکھتے تھے ۱۹۳۰ء میں گورنر پنجاب کو گولی سے اڑانے والوں میں آپ شامل تھے گورنر پر گولی چلانے والے کامریڈ شری کشن کو پھانسی کی سزا ہوئی یہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بری کردیئے گئے زندگی بھر آزادی کے لیے کوشاں رہے ۱۹۸۲ء میں دہلی میں انتقال ہوا۔

پرتاپ چند رائے بریلی کے باشندے تھے آپ نے '' آزاد'' اور '' آزادی'' کے نام سے دو اخبار جاری کئے ۔والد منشی رنگی لال سنہا اور والدہ جانکی دیوی تھیں ابتدائی تعلیم بریلی کے ایک پرائمری اسکول میں اور پھر سرسوتی ودیالیہ میں داخلہ لیا اور ہائی اسکول پاس کیا گاندھی جی عدم تشدد تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا آپ سرگرم سماجی کارکن تھے انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد بی اے بریلی کالج میں داخلہ لیا اور اسی زمانے میں ایک ہفت روزہ اردو اخبار '' آزاد'' جاری کیا اور ایک ماہنامہ '' آزادی'' کا اجراء کیا۔آزاد صاحب ایک متحرک انسان تھے ایک اچھے ادیب بیباک صحافی آپ نے اپنے اخبار اور رسالے کے ذریعہ گاندھی جی کی ستیہ گرہ کی تحریک کی پرزور حمایت کی نوجوانوں اور طلباء کو بیدار کیا۔اس تحریک میں اپنے آپ کو پیش کردیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اخبار سے ضمانت طلب کرلی گئی اور ان کے پریس کو ضبط کر کے انھیں جیل بھیج دیا گیا۔آپ نے ۱۹۴۶ء میں بی اے ۱۹۴۸ء میں ایم اے پاس کیا ۱۹۴۶ء میں یو پی اسٹوڈنٹس کانگریس کے صدر اور ۱۹۵۲ء میں یو پی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔آپ کی تمام عمر ادب وصحافت کی خدمت میں گزری آپ کے افسانوی مجموعے ''زمانے کی آنکھ'' اور ''گھر کا چراغ'' شائع ہو چکے ہیں۔''انقلاب وطن'' نظموں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے نظم ''زندان بلا'' اور ''فلسفہ محبت'' پر ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔

زندان بلا نظم بریلی کے جیل خانہ کی حالت کو دیکھ کر لکھی تھی ''فلسفہ محبت'' میں انھوں نے عشق ومحبت کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔نظموں کا ایک مجموعہ ''انقلاب وطن'' بھی شائع ہو چکا ہے اور اس کا انتخاب انقلاب وطن کے نام سے نومبر ۱۹۶۳ء میں ساہتیہ اکادمی بریلی سے شائع ہوا ہے۔ان کی نظم ''کسان'' ۱۹۴۲ء کی تحریک کی یادگار ہے اور نظم ''قومی غدار سے'' آزاد صاحب نے سرکار برطانیہ کے ان جی حضوروں کے خلاف لکھی تھی جو ۱۹۴۲ء کی تحریک میں خفیہ سرگرمیوں کا پتہ لگا کر دیش بھگتوں کو جیل بھجوا دیتے تھے۔ ۸

اردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' کلکتہ سے شائع ہوا اسے انگریزوں کے مفادات کا حامل بھی قرار دیا جاتا ہے اس کے مالک ہری دت اور ایڈیٹر لالہ سدا سکھ تھے جب اس اخبار کی وطن دوستی میں اضافہ انگریزوں نے محسوس کیا تو اس پر عتاب نازل ہوا اس اخبار نے ہی پنجاب کی سکھ ریاست پر انگریزوں کے حملے کی تیاری والی خبر حملہ سے بہت پہلے شائع کر دی تھی۔

پرتاپ گڑھ کے آنریری مجسٹریٹ راجہ رائے سنگھ نے ۱۸۸۴ء میں لندن سے ''ہندوستان'' نامی رسالہ جاری کیا تھا۔ اردو انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں میں اس کی اشاعت ہوتی تھی۔ ہندوستانی نوجوانوں کے جذبات کی ترجمانی انگریزوں کے مظالم سے آگاہی، انگریزوں کے حقارت آمیز سلوک اور تجارتی استحصال پر تنقید کرنا اس اخبار کے مقاصد تھے۔

دیش بھکت اخبار نویسوں اور صحافیوں میں دینا ناتھ، نانک چند ناز، بل دیو اور میلا رام وفا کا نام قابل ذکر ہے۔ وفا صاحب کی ہمہ گیر شخصیت میں کئی اوصاف یکجا تھے۔ آپ سرگرم سیاسی کارکن، آزمودہ اخبار نویس اور زبردست شاعر تھے۔ آپ کی نظموں کا ایک ایک بند انگریزی سرکار کے لیے چیلنج ہوتا تھا۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

برطانیہ سے کہہ دو   اب ذلت غلامی
کرنا نہیں گوارا   ہندوستان ہمارا
برطانیہ سے کہہ دو   ہندوستاں کے ہم ہیں
برطانیہ تمہارا   ہندوستاں ہمارا
برطانیہ تمہار   ہندوستاں ہمار

ان پوشیدہ الفاظ کی سادگی اور چوٹ بڑی زبردست ہے۔

ایک باغیانہ نظم شائع کرنے کے جرم میں وفا صاحب کو عدالت میں پیش کیا گیا تو مقدمہ کی کاروائی کے دوران آپ نے ایک نظم لکھ ڈالی اور انگریزی حکومت کے قانون کا منہ چڑھا دیا۔ [9]

اردو اخبارات کی تاریخ میں ایک اخبار ''سوراجیہ'' ایسا بھی ہے جس کے تمام مدیروں کو قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ۱۹۰۷ء میں الہ آباد سے پنجابی انقلاب پسندوں نے نکالا تھا اس اخبار کو لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک کا سپورٹ اور نیک خواہشات حاصل تھیں۔ اس کے پہلے مدیر مہا تما شانتی نارائن تھے جنھوں نے ساڑھے تین سال قید با مشقت کی سزا پائی سدھا رام اور نند گوپال کو تیس تیس سال با مشقت کی سزا ملی، باجو رام کو اکیس سال اور رام ورما کو دس سال کی قید با مشقت کی سزا ملی۔ ان سب کا جرم یہ تھا کہ ان لوگوں نے باغیانہ اداریے اور نظمیں شائع کی تھیں چند سالوں میں جتنے مدیر ہوئے وہ سب آزادئ وطن کی کوششوں کی وجہ سے معتوب ہوئے۔ امیر چند بموال ''سوراجیہ'' کے نویں ایڈیٹر تھے۔ ایک باغیانہ مضمون سوراجیہ میں لکھا اور لکھتے ہی ضبط ہوا مقدمہ چلا مگر قسمت سے بچ نکلے اور کالا پانی کی سزا سے بچ گئے۔

آپ نے ایک اخبار ''فرینٹئر ایڈوکیٹ'' پشاور سے جاری کیا تھا آزادی کے لیے تن من دھن لٹانے والے آدمی تھے اردو، ہندی، انگریزی اور پشتو کے عالم تھے کئی بار جیل بھی گئے کانگریس کے سرگرم کارکن تھے خان عبدالغفار کو چار آنے والا ممبر آپ نے ہی بنایا تھا صوبہ سرحد کی تمام تحریکات میں سرگرم رہے اور قائدانہ کردار ادا کیا۔ لدھا رام سوراجیہ اخبار کے چھوتھے ایڈیٹر تھے ان کی تحریریں باغیانہ نوجوانوں کو جذبۂ جہاد پر آمادہ کرنے والے ہوتی تھیں جو نوجوانوں میں جذبۂ آزادی اور جوش و جنون پیدا کر دیتی تھیں حریت پسندی کی وجہ سے کئی بار جیل کی سزا پائی۔

ہندوستان کی جنگ آزادی اور آزادی کی جدوجہد میں اردو صحافت نے ایثار و قربانی، حب الوطنی، پامردی، استقلال کی ایسی بلندیاں حاصل کیں جس کی مثال دنیا میں مشکل سے ملے گی۔ کامریڈ راجند تحریک آزادی اور اردو صحافت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حصول آزادی یعنی ۱۹۴۷ء تک ہندوستانی اخبار نویسی نے کئی مدوجزو اور تغیر و تبدل دیکھے ہیں اور اردو صحافت کے سفر نے بھی نشیب وفراز کے کئی دور دیکھے ہیں۔ تاہم ایک بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اردو اخباروں میں سے بعض خاص خاص اخباروں نے وقتی مصلحتوں کا شکار ہو کر اگر قومی جدوجہد سے سرگرم وابستگی سے کنارہ کشی بھی اختیار کی ہو لیکن کلی طور پر ان کی ہمدردیاں ہندوستانی عوام کی امیدوں اور امنگوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ کیونکہ انگریزی اخباروں کی نسبت اردو اخباروں کا ہاتھ عوام کی نبض پر زیادہ ہوتا تھا اور عوام میں جب بھی کبھی کوئی ہیجان پیدا ہوتا یا کوئی تحریک اٹھتی تو اردو اخبار اس تحریک میں عوام کی مدد کے لیے میدان میں فوراً اتر آئے۔ عوام ہی ہندوستانی زبان کے اخباروں کے حقیقی اور زبردست سرپرست ہوتے تھے اور عوام کی سرپرستی ہی ان اخباروں کا سرمایۂ حیات تھا۔ جب ہمارے ملک میں اسمبلیوں اور کونسلوں کا سلسلہ نہیں شروع ہوا تھا تو ہندوستانی یا اردو اخبارات ہی رائے عامہ کو ظاہر کرنے یا اسے منظم کرنے کا کام کرتی تھیں۔ اس لیے اردو صحافت کی عوام کی نگاہوں میں خاص قدر و منزلت تھی اس کے مقابلے میں انگریزی اخبار محض سطحی اور مصنوعی ماحول میں اپنے اثر و رسوخ کی خود فریبی میں رہتے تھے۔'' [10]

یہاں اس مقالہ میں چند ان غیر مسلم صحافیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جنھوں نے کوئی اخبار نکالا یا کسی اخبار کی ادارت کے فرائض انجام دیئے ورنہ ایسے غیر مسلم صحافی جو اپنی نظموں و نثر کے ذریعہ اردو صحافت میں شریک رہے اور تحریک آزادی سے وابستہ تھے ان کی تعداد ان گنت ہے مذکورہ مدیرین، ایڈیٹروں اور اخبار کے بانیوں کی خدمات زریں حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں اور مذکورہ غیر مسلم صحافیوں کی گرانقدر خدمات اور مجاہدانہ و سرفروشانہ کردار سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ تحریک آزادی میں سارے ہندوستانی بلا تفریق مذہب و ملت، قومیت و علاقائیت، ایک صف میں کھڑے تھے اور اردو زبان سب ہندوستانیوں کی مشترکہ وراثت اور امانت ہے۔ آج بھی ضرورت اسی بات کی ہے کہ ہم باہم یکانگت اور ہم آہنگی و بھائی چارگی کے ساتھ اردو زبان کی ترقی کے لیے کوشاں رہیں اردو محبت کی زبان ہے اس کو نفرت و عداوت کا ذریعہ نہ بنائیں۔ اردو کی خوشبو سے کل چمنستان ہند مہکا تھا اور آج بھی اردو کی عطر بیزی قائم و دائم ہے بس ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی خوشبو کو اپنے رگ و پے میں بسالیں اور اپنی مشامِ جاں کو معطر کر لیں۔

حواشی

۱۔ تحریک آزادی اور ۱۹ویں صدی کے اردو اخبارات کا کردار، جناب راج نرائن راز مشمولہ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، مرتب، ناشر نقوی، ۱۹۸۸، ص، ۴۷، ۴۸
۲۔ تاریخ صحافت اردو جلد اول، امداد صابری یونین پریس، اردو بازار جامع مسجد، دہلی، ص، ۴۴۵
۳۔ ہندوستان کی جنگ آزادی اور اردو صحافت، جناب کامریڈ راجندر مشمولہ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، مرتب، ناشر نقوی، ۱۹۸۸، ص، ۵۹، ۶۰
۴۔ اردو صحافت اور آزادی کی تحریک جناب محمد سلیمان صابر، مشمولہ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ۔ مرتب ناشر نقوی، ۱۹۸۸، ص، ۴۳
۵۔ اردو صحافت۔ مرتب، انور علی دہلوی مشمولہ مقالہ اردو کے نامور صحافی، گربچن چندن، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۰، ص، ۱۱۳
۶۔ بیسویں صدی کے تیر و نشتر، خوشتر گرامی، ناشر بیسویں صدی، دریا گنج، دلی نمبر ۶، ۱۹۷۴، ص، ۲۲۴
۷۔ آج کل اپریل ۱۹۸۹، ص، ۴۸ رام لعل بھوپال پبلیکیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند
۸۔ دو ماہی اکادمی لکھنؤ جولائی اگست ۱۹۸۴ ایڈیٹر محمد رضا انصاری ص، ۵۴، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ
۹۔ ہندوستان کی جنگ آزادی اور اردو صحافت، جناب کامریڈ راجندر مشمولہ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ۱۹۸۸۔ ص، ۷۰
۱۰۔ ایضاً۔ ص، ۶۷، ۶۸

❑❑❑

عظمت علی

شعبۂ اردو و فارسی، سی۔ ایم کالج، دربھنگہ

7388886628

1857: تحریک آزادی؛ اپنوں کی درپردہ سازش کا شکار

برطانیہ کے بارے میں کہا جاتا کہ اس پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ یہ ایک واضح اشارہ تھا اس کی وسعت مملکت پر۔ '1921ء کو اپنی طاقت اور وسعت کی انتہا پر یہ (مملکت) 33 ملین مربع کلو میٹر رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کے زیر نگیں 45 کروڑ 80 لاکھ لوگ تھے جو اس وقت کی عالمی آبادی کا ایک چوتھائی بنتے ہیں۔' (آزاد دائرۃ المعارف: سلطنت برطانیہ)

قریب قریب 200 برس ملک عزیز بھی اس کے چنگل میں پھنسا رہا، اس طویل مدت کا سبب ہندوستانیوں کے باہمی اختلافات اور دوست نما دشمن کی غداری رہی تھی، 1707ء سے 1757ء تک دلی حکمرانوں نے تخت و تاج کی ہوس میں آپس میں خونی انقلاب برپا کرتے رہے اور بالآخر اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار ڈالی، اب کیا تھا مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا، اس منتشر شیرازہ کو دیکھ اغیار نے بازی مار دی۔ ڈاکٹر سلیم احمد کی کتاب 'تحریک آزادی؛ کچھ بھولی بسری کڑیاں' میں اپنوں کی غداری کے حوالہ سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> '1757ء میں انگریزوں نے اپنی قوت کو مستحکم بنانے کی غرض سے کلکتہ میں فورٹ ولیم کی تعمیر کا کام شروع کیا تو اس پر نواب سراج الدولہ نے اعتراض کیا جس سے سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان پلاسی میں جنگ ہوئی اس جنگ میں سراج الدولہ کے وزیر میر جعفر کی دغا و سازش کی بناء پر انگریزوں کی تین ہزار فوج سراج الدولہ کے چالیس ہزار پیادے اور پندرہ ہزار سواروں کو میدان سے بھگانے میں کامیاب ہوگئی۔ بنگال انگریزوں کے قبضہ میں آگیا اور انگریزوں نے میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا۔'

(تحریک آزادی کچھ بھولی بسری کڑیاں ص 13 طباعت: آفسٹ پریس نخاس چوک گورکھپور، سن طباعت 2002)

یوں وہ سیاہ دل گوروں نے ہندوستان پر اپنا آہنی پنجہ ثبت کرنے لگے اور 28/جون 1858ء کو تاجر، حکمران ہو گئے، یوں وہ آقا بن گئے اور مالک سے غداری کرنے لگے، دولت و حکومت پر قابض ہوتے ہی انہوں نے ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالے جبکہ اس سے پہلے کچھ کم مظالم نہ تھے۔ یہ سلسلۂ بہیمیت یوں ہی رواں رہا اور لوگ تشدد و فساد کی چکی میں پستے رہے، اپنے تئیں دفاع کرتے رہے اور آزادی کی خاطر جد و جہد کا دامن کبھی بھی نہیں چھوڑا لیکن باقاعدہ آزادی کی پہلی جنگ کا آغاز 1857 میں ہوا اگرچہ اس سے قبل بہت ساری عظیم اور کامیاب جنگیں لڑی گئیں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزوں نے فوجوں کو دیئے جانے والے کارتوس کو گائے اور سور کی چربی سے لیپ دیا، چونکہ ان کے استعمال سے پیشتر، ان پر چڑھی چھلی کو دانتوں سے کترنا پڑتا تھا، اس لئے مذہب پرست ہندو اور مسلم دونوں برانگیختہ ہو گئے چونکہ ہندو عقیدہ کے مطابق گائے محترم ہے جبکہ مسلمان کے نزدیک سور نجس جانور میں سے ہے۔ اس پر ان کے جذبات ابل پڑے، سپاہیوں نے ان کارتوسوں کے استعمال سے انکار کیا، تقریباً 35 فوجیوں کی وردیاں سرعام اتار لی گئیں، ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں اور دس سال کی قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ اب تو پانی سر سے گذر چکا تھا، مزید ظلم سہنے کا وقت نہیں رہا تھا، اب جان کی بازی لگانے کا دور آگیا تھا۔ ہوا یہ کہ اسلحہ خانے کے ایک ملازم نے ایک برہمن سے پانی مانگا۔ برہمن نے اس کی ذات کے متعلق پوچھا، اس نے مضحکانہ لہجے میں کہا: اجی ذات پات کیا پوچھتے ہو، چند دن بعد جب سور اور گائے کی چربی لگے کارتوس کاٹیں گے آپ کا دھرم بھی باقی نہ رہے گا۔

(1857 کی آزادی میں میرٹھ کا خوں چکا واقعہ، از عبداللہ دامدابو)

> "دیکھتے دیکھتے یہ انقلابی تحریک پورے ملک میں پھیل گئی اور ہر جگہ سے آزادی کے متوالوں نے تحریک آزادی کا پرچم بلند کر دیا۔ اودھ (لکھنؤ) میں واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل نے انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیئے، بندیل کھنڈ میں رانی لکشمی بائی نے برہنہ شمشیر سے غاصبوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے، کانپور میں نانا صاحب اور وزیر عظیم اللہ خاں نے انگریزوں کے ہوش اڑا دیئے، مگر انگریزوں نے ہمت نہ ہاری اور دلی پر دوبارہ قابض ہونے کی غرض سے انقلابیوں پر حملہ کیا اور اپنی اس چال میں کامیاب ہوئے، آزادی کے متوالوں کی ایک بڑی فوج بخت خان کی قیادت میں 2 جولائی کو دلی میں داخل ہوئی جس نے 9 جولائی کو برطانوی فوج پر ایسا کامیاب حملہ کیا کہ انگریزوں کو دھول چٹا دی لیکن مقام تاسف یہ کہ درباری سازشوں نے بخت خان جیسے مستعد اور تجربہ کار جنرل کو برطرف کر دیا اور یوں انگریزوں کا پلڑا بھاری ہوگیا۔"

یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، اسے دبانے کے لئے 8/مئی 1857ء کو کرنل سمائتھ نے ہندوستانی فوجوں کو پریڈ کے موقع پر سمجھایا لیکن وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ 10/مئی 1857ء کو باقاعدہ جنگ آزادی کا اعلان ہوگیا، صبح کے وقت بالکل مطمئن طور پر انگریز گرجا گھر جانے میں مصروف تھے، کچھ وہاں پہونچ چکے تھے، ٹھیک اسی وقت فوجوں نے بندوقوں سے فائرنگ کرنا شروع کر دی، اس وقت حالات سپاہیوں کے ساتھ تھے، اگر وہ چاہتے ایک ایک کو قتل کر دیتے مگر مقصد ظلم نہیں تھا بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ تھا

جس کے باعث ملک میں فسادات اور خونی ماحول بن چکا تھا، اس زبردست حملہ سے انگریزوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔انہوں نے اسے ناکام بنانے کی بہت کوششیں کیں مگر سب ناکام ثابت ہوئیں۔ہندوستانی افواج نے وہ تیور دکھائے کہ ان کے پرخچے اڑ گئے۔ پہلے پہل انہوں نے اپنے ہم منصب فوجوں کو آزاد کرایا اور میرٹھ کو فتح کرنے کے بعد انقلابیوں نے دلی کا رخ کیا اور یوں لال قلعہ کو بھی فتح کرلیا، وہاں مغل تہذیب وثقافت کا آخری چراغ ٹمٹما رہا تھا، بہادر شاہ ظفر، ان کی عمر کے بیاسی برس گذر چکے تھے، اب ان میں وہ قائدانہ صلاحیت نہ تھی۔نوجوانی میں وہ بہترین تیز انداز، مشاق، نشان باز اور شہ سوار تھے لیکن ان دنوں ان کا زیادہ تر وقت شاعری، موسیقی اور دیگر مشغلوں میں گذرتا، ان کی حکومت بھی اب باقی نہ رہی تھی، ان کی مملکت کا قلمرو بھی لال قلعہ کی دیواروں پر جا کر تمام ہوجاتا تھا، ان حالات میں غیر منظم افواج کی علمبرداری سنبھالنا بہت مشکل مرحلہ ہوچکا تھا لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا، سو انہوں نے کانٹوں کے تاج پہن لئے۔

دیکھتے دیکھتے یہ انقلابی تحریک پورے ملک میں پھیل گئی اور ہر جگہ سے آزادی کے متوالوں نے تحریک آزادی کا پرچم بلند کردیا۔اودھ (لکھنؤ) میں واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل نے انگریزوں کے دانت کھٹے کردیئے، بندیل کھنڈ میں رانی لکشمی بائی نے برہنہ شمشیر سے غاصبوں کو ناکوں چنے چبوادیئے، کانپور میں نانا صاحب اور وزیر عظیم اللہ خاں نے انگریزوں کے ہوش اڑادیئے، مگر انگریزوں نے ہمت نہ ہاری اور دلی پر دوبارہ قابض ہونے کی غرض سے انقلابیوں پر حملہ کیا اور اپنی اس چال میں کامیاب ہوئے، آزادی کے متوالوں کی ایک بڑی فوج بخت خان کی قیادت میں 2 جولائی کو دلی میں داخل ہوئی جس نے 9 جولائی کو برطانوی فوج پر ایسا کامیاب حملہ کیا کہ انگریزوں کو دھول چٹادی لیکن مقام تاسف یہ کہ درباری سازشوں نے بخت خان جیسے مستعد اور تجربہ کار جنرل کو برطرف کردیا اور یوں انگریزوں کا پلڑا بھاری ہوگیا۔اس کے بعد 16 ستمبر کو بعض امیروں کی سازشوں کے باعث، بہادر شاہ ظفر نے آخری لڑائی میں انقلابیوں کا ساتھ دینے کے بجائے 17 ستمبر کو قلعہ خالی کردیا اور ہمایوں کے مقبرہ میں چلے گئے۔ 20 ستمبر تک دلی اپنوں سے خالی ہوگیا اور لال قلعہ پھر انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔اس کے بعد انہوں نے جو مظالم ڈھائے کہ تاریخ شرمسار ہے۔'میجر ہڈسن نے بہادر شاہ ظفر کے چاروں لڑکوں مرزا غلام، مرزا خضر سلطان، مرزا ابوبکر اور مرزا عبداللہ کو بھی قید کرلیا، میجر ہڈسن نے سبھی چاروں صاحبزادوں کا سر کاٹا اور ان کا گرم خون چلو سے پی کر ہندوستان کو آزاد کرنے کی چاہ رکھنے والوں سے انگریزوں کے تئیں جنگ اور بغاوت کو جاری رکھنے کا خطرناک وحشیانہ عہد کو جاری رکھا۔بہادر شاہ ظفر نے اپنے بیٹوں کے کٹے ہوئے سروں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر درد بھرے الفاظ میں ان کے لیے دعا کرتے ہوئے کہا: 'تیمور کی اولاد ایسے ہی سرخرو ہوکر باپ کے سامنے اپنا فرض ادا کرتے ہیں'۔اس کے بعد شہزادوں کے دھڑ کو توالی کے سامنے اور کٹے ہوئے سروں کو خونی دروازے پر لٹکا دیا گیا۔'

(ویکیپیڈیا؛ بہادر شاہ ظفر، بحوالہ سانحہ: بہادر شاہ ظفر جنگ آزادی کے اولین مجاہد ترتیب از عرفان عزیز صفحہ 137)

اس طرح انہوں نے تشدد کا ایک نیا باب کھول دیا، چن چن کر لوگوں کا بہیمانہ قتل کرنا شروع کردیا، انہیں سولی پر چڑھادیا اور جانے کیا کیا نہ ظلم کیے اور پھر ان کی جاگیروں پر قابض ہوگئے۔ حالات بدل چکے، اب کسی میں ہندوستان کی آزادی کے لیے مرمٹنے کی طاقت نہ رہی البتہ جذبہ ضرور رہا اور آزادی کا چراغ ان کے شعور کو جلا بخش رہا تھا۔Notes on Indian affairs کے مصنف Frederick John Shore کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں 'اگرچہ بظاہر ہرطرف ایک سکون اور خاموشی کا عالم نظر آتا ہے لیکن فی الحقیقت سارا ماحول ایک بارود خانے کی مانند ہوگیا ہے جس کو ایک معمولی سی چنگاری بھی کسی وقت مشتعل کرسکتی ہے۔'

(تحریک آزادی کچھ بھولی بسری کڑیاں ص 14 طباعت: آفسٹ پریس نخاس چوک گورکھپور، سن اشاعت 2002)

حقیقت یہ کہ محبان آزادی نے جان ہتھیلی پر رکھ آزادی وطن کے لیے لڑے لیکن غیر منظم اور ماہر علمبردار کی سپہ سالاری کے فقدان نے انہیں کامیابی سے پیچھے ڈھکیل دیا ورنہ سب کچھ تھا سوائے تحریک میں نظام اور منصوبہ بندی کے۔اس جنگ نے ہمیں تلخ سبق یہ دیا کہ ٹکڑیوں میں بٹ کر کبھی بھی جنگ فتح نہیں ہوتی، جنگ ہمیشہ امیر لشکر کے اعلیٰ تدابیر پر فتح ہوتی ہے۔

❏❏❏

غزل

ستم کرے جو کوئی اس کا غم نہیں کرتے
مگر کسی پہ کبھی ہم ستم نہیں کرتے

لبوں پہ اپنے تبسم سجائے رکھتے ہیں
ہم آنسوؤں سے کبھی آنکھیں نم نہیں کرتے

تعلقات میں چاہے اضافہ ہو کہ نہ ہو
مٹھاس رشتوں کی بالکل بھی کم نہیں کرتے

ہے آتی جاتی خوشی اس لئے تو ہم اس کو
غم حیات ترا ہمقدم نہیں کرتے

جو چاہتے ہیں قصیدے ہم ان کے پڑھتے رہیں
انہیں بتادو کہ یہ کام ہم نہیں کرتے

نہ جانے کون سے رشتے کی ہے تلاش انہیں
جو عمدہ رشتے کو بھی محترم نہیں کرتے

وہ دیکھیں کہکشاں خس پوش کی مری جنّت
محل بھی اپنے جو رشکِ ارم نہیں کرتے

عابدہ خاں کہکشاں
لکھنؤ، موجودہ رہائش امریکہ
9997129863

مبینہ
کبیر نگر، بابر پور، موج پور میٹرو اسٹیشن، دہلی
8010798159

اردو شاعری میں حب الوطنی کے عناصر

حب الوطنی کے جذبات تقریباً ہر انسان میں ہوتے ہیں لیکن ہر کوئی اس جذبے کا اظہار نہیں کر پاتا لیکن یہ جذبات شاعر اور ادیب نہایت خوبصورتی کے ساتھ پر اثر طریقے سے اپنی تخلیق میں پیش کر دیتے ہیں کیونکہ وہ سماج کے دوسرے افراد سے زیادہ حساس اور جذباتی ہوتے ہیں اور اظہار پر قدرت رکھتے ہیں۔ اردو شاعری میں بھی ابتدا ہی سے ان جذبات کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ اردو میں نظم شاعری ابتدا ہی سے موجود تھی جو غزل سے زیادہ مشابہت رکھتی تھی کیونکہ اس میں بحر اور قافیہ دونوں ہوتے تھے لیکن تسلسل بیان کی وجہ سے یہ غزل سے مختلف تھی۔ قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی نظم کی ہی مختلف قسمیں کہلائیں بس خیال یا معنی کے اعتبار سے اس میں تسلسل ہو اور ہر شعر دوسرے شعر سے پیوست ہوتا چلا جائے تو یہ نظم ہی کہلاتی آئی ہیں۔ ہندوستان صدیوں سے مختلف مذاہب، ذات، رسم و رواج زبان اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں ہندو، مسلم سکھ، عیسائی مذہب و ملت کی تقریر تفریق کے بغیر ایک ساتھ مل کر محبت اتحاد اتفاق بھائی چارگی، امن اور یکجہتی کے ساتھ رہتے چلے آ رہے ہیں۔ یہی ملی جلی تہذیب ہندوستانی تہذیب ہے۔ اسی تہذیب میں سموئی وطن پرستی کی مثالیں اردو شاعری میں خصوصاً اردو نظموں میں بھری پڑی ہیں۔ امیر خسرو نے اس وطن پرستی کے احساسات و جذبات کے اظہار کی بنیاد ڈالی اسے ہر زمانے اور ہر دور میں فروغ ملا۔ ترلوک چند محروم، پنڈت برج نارائن چکبست، منوہر سہائے انور، آنند نارائن ملا، رگھوپتی سہائے، فراق گورکھپوری، جگن ناتھ آرزو، دیا شنکر نسیم، کمار پاشی، جمنا پرساد راہی وغیرہ غیر مسلم شعرا نے جہاں اردو شاعری میں اپنی تہذیبی مذہبی روایتی باہمی یگانگت بھائی چارگی سے بھرے احساسات و جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اپنی وطن پرستی کو نمایاں کیا وہیں دوسری طرف اردو نظموں میں نظم نگاری نظیر اکبر آبادی، الطاف حسین حالی محمد حسین آزاد، اکبر الہ آبادی، سرور جہاں آبادی، اسماعیل میرٹھی، علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، اسرار الحق مجاز، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین، فیض احمد فیض، کیفی اعظمی، ساحر نظامی جمیل مظہری جان نثار اختر وغیرہ نے اردو شاعری میں حب الوطنی کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

اردو کی ابتدا سے دیکھیں تو سب سے زیادہ حب الوطنی قلی قطب شاہ کی شاعری میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی نظموں میں عید، رمضان، بسنت، ٹھنڈا کالا موسم، پریم کی کہانیاں، حیدر محل، بارہ پیاریاں اور مشتری وغیرہ نظمیں اہم ہیں۔ ان کی نظم ٹھنڈا کالا موسم کا ایک شعر دیکھیے۔

ہوا آئی ہے لے کے ٹھنڈا کالا
پیا بن ستاتا ہے مدن بالے بالا
رہن نہ سکے من پیا باز دیکھے
ہوتے تن کو سکھ جب ملے پیو بالا

رمضان عید آیا مل کے فروزی سوں
خوشی و خری ہور آنند نو روزی سوں
سنی عید جلوہ گر ہو گئے دن صیام ساقی
نو چند تھے ساغراں میں بھرے مدام ساقی

بسنت پر بھی قلی قطب شاہ کی پوری نظم ہے اسی طرح تمام ہندوستانی عناصر پر قلی قطب شاہ کی شاعری موجود ہے انہیں کی طرح ولی اور ولی کے بعد سراج اورنگ آبادی بھی اس سلسلے میں اہم کڑیاں ہیں۔

”نظیر نے اپنی نظم گوئی کے ذریعے ہندوستانی تہذیب، ہندوستانی عوامل و عناصر کو بیان کیا کیونکہ وہ ایک آزاد شاعر تھے اور اپنی مرضی کے مطابق لکھتے تھے۔ جو دیکھتے جہاں رہتے وہیں کے بارے میں اس طرح لکھ دیتے کہ قاری اس منظر کو اپنے سامنے محسوس کرتا۔ انہوں نے شاعری میں ہندوستانی رسم و رواج، تہوار، وضع قطع، زبان، مشترکہ تہذیب اور ہندوستانی قدرتی عناصر اور دیگر اہم عناصر کے اثرات کی چھاپ چھوڑی ہے۔ نظیر ایک ایسے شاعر گزرے جن کی شاعری اردو ادب میں بام عروج پر پہنچ گئی۔ کہیں انہوں نے اپنے شہر آگرہ کو دعائیں دیتے ہوئے اس کی خوبصورتی اور خوبیوں کا بیان کیا ہے تو کہیں اس شہر کی خوشحال زندگی یہاں پر پیدا ہونے والی فصلوں کا ذکر کیا ہے۔ نظیر ایک ایسا شاعر تھا جسے ہندوستان کی ہر شے سے محبت تھی“۔

شمالی ہند میں گویا اردو کی نظمیہ شاعری اٹھارویں صدی عیسوی سے پہلے افضل جھنجھانوی کی نظم بکٹ کہانی جو مکمل طور پر ہندوستانی سماج کا عکس ہی تھی نظر آتی ہے۔ جعفر زٹلی، نواب سراج الدین، محمد خان، شاکر ناجی، آبرو پھر سودا اور میر کے یہاں بھی اس طرح کے نمونے نظر آتے ہیں۔ میر کی ایک مثنوی کا عنوان ''مثنوی در جشن ہولی وکتخدائی''، جس میں انہوں نے آصف الدولہ کی شاعری اور ہولی کے جشن کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس کے ذریعے قومی یکجہتی اور وطن پرستی کا اظہار بھی ہوا ہے۔ اس کے بعد اردو نظم نگاری میں ایک نیا موڑ نظیر اکبر آبادی کی آمد کے ساتھ آتا ہے۔

نظیر نے اپنی نظم گوئی کے ذریعے ہندوستانی تہذیب، ہندوستانی عوامل وعناصر کو بیان کیا کیونکہ وہ ایک آزاد شاعر تھے اور اپنی مرضی کے مطابق لکھتے تھے، جو دیکھتے جہاں رہتے وہیں کے بارے میں اس طرح لکھ دیتے کہ قاری اس منظر کو اپنے سامنے محسوس کرتا۔ انہوں نے شاعری میں ہندوستانی رسم ورواج، تہوار، وضع قطع، زبان، مشترکہ تہذیب اور ہندوستانی قدرتی عناصر اور دیگر اہم عناصر کے اثرات کی چھاپ چھوڑی ہے۔ نظیر ایک ایسے شاعر گزرے جن کی شاعری اردو ادب میں بام عروج پر پہنچ گئی۔ کہیں انہوں نے اپنے شہر آگرہ کو دعائیں دیتے ہوئے اس کی خوبصورتی اور خوبیوں کا بیان کیا ہے تو کہیں اس شہر کی خوشحال زندگی، یہاں پر پیدا ہونے والی فصلوں کا ذکر کیا ہے۔ نظیر ایک ایسا شاعر تھا جسے ہندوستان کی ہر شے سے محبت تھی اور اس نے ان کا اظہار بھرپور طریقے سے اپنی نظموں میں کیا بھی، کہیں وہ برسات گرمی اور جاڑے کے بارے میں نظمیں کہتے تو کہیں یہاں کے پھل اور پھولوں کے متعلق لکھتے۔ کہیں ہندوستانی تیوہار کے بارے میں لکھتے تو کہیں یہاں کی فصلوں کے بارے میں کبھی میلے ٹھیلوں کے بارے میں لکھتے تو کبھی گھر میں بچے کی پیدائش پر ہونے والی چہ می گوئیوں سے متعلق لکھتے۔ نظیر کی نظم ہولی کا یہ بند دیکھیے۔

یہ سیر ہولی کی ہم نے تو برج میں دیکھی
کہیں نہ ہووے گی اس لطف کی میاں ہولی
کوئی تو ڈوبا ہے دامن سے لے کے تا چولی
کوئی تو مرلی بجاتا ہے کہہ کنہیا جی
ہے دھوم دھام یہ بے اختیار ہولی میں

بقول سید مجاور حسین:

''نظیر ہندوستان کی ادبی تاریخ کے واحد عوامی شاعر ہیں جنہوں نے دورِ حاضر کی عوامی شاعری کے لیے راہیں اور سمتیں متعین کیں اور جنہوں نے اٹھارویں صدی میں مشترکہ کلچر قومی یکجہتی کے تصورات اور اس کی معاشرتی تہذیب کو اپنی شاعری میں جگہ دی جو تقریباً پانچ ہزار سال کی تاریخ کی وراثت تھی۔''

(سید مجاور حسین، اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر، 2004، ص۔ 184)

نظیر کی اس روایت کو جدید نظم نگاروں نے آگے بڑھانے کا کام کیا اور نظم کو ایک نئی ہیّئت اور صورت دی۔ جدید نظم نگاری سے پہلے شعری غزل کو چھوڑ کر سبھی شعری اصناف کو نظم ہی کے زمرے میں رکھا جاتا تھا۔

جدید نظم نگاری کے آغاز کے ساتھ نظم نگاری ایک الگ صنف سخن کی طرح اپنے لیے الگ بہت ہیّیت کے ساتھ اپنی الگ پہچان قصیدہ، مثنوی اور دیگر شعری اصناف سے مختلف ہو کر سامنے آئی لیکن قارئین اس صنف سخن کو نظیر کے یہاں پہلے ہی دیکھ چکے تھے لیکن نظیر کے بعد یہ سلسلہ دراز ہوتا نظر نہیں آیا ان کے بعد کہ شاعروں نے غزل قصیدہ اور مثنوی کی صنف پر زور دیا سن 1867 میں پھر جب انجمن پنجاب وجود میں آئی تب ان جدید نظم نگاری کو فروغ ملا۔ اس جدید نظم نگاری کی بنیاد مولانا محمد حسین آزاد کے من میں بہت پہلے سے پڑ چکی تھی۔ اس صحن میں اس ضمن میں پنڈت کیفی رقم دراز ہیں کہ:

''مولانا آزاد کو سن 1874 سے بہت برس پہلے اردو کی تجدید اور اصلاح کا خیال پیدا ہوا تھا چنانچہ سن 1867 کے ایک جلسے میں آپ نے ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات "اس موضوع پر ایک مفصّل تقریر فرمائی۔''

(پنڈت کیفی منثورات مرتبہ کیفی گوپی چند نارنگ ص 221)

المختصر مولانا محمد حسین آزاد کی تقاریر نے انجمن پنجاب کے زیر اثر نہ صرف زبان کی اصلاح کی بلکہ نئی نظم کی صورت میں ایک نئی صنف شاعری " نظم " کے لیے زمین ہموار کی۔ جن میں ہندوستانی معاشرت، مناظر قدرت، تہذیب اور حب الوطنی کے جذبات کا مکمل اظہار تھا۔ نظم زمستان میں ہندوستان کے خاص موسم جاڑے کی آمد اور اس کے اثرات پر بہت عمدہ طریقے سے آزاد نے روشنی ڈالی ہے جس میں دیہات کی تہذیبی زندگی کا پورا نقشہ ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔ یہ خالص ہندوستانی رنگ ہے یہ اشعار دیکھیے۔

مارے سردی کے جگر سینوں میں تھراتے ہیں
بچے ماں باپ کی بغلوں میں گھسے جاتے ہیں
ہے کوئی چھینٹ کا اوڑھے مرعل بیٹھا
پر پھیلائے ہوئے جیسے کوئی بلبل بیٹھا
اوڑھ بیٹھا کوئی سردی لحاف کو اپنا ہے
کوئی کر بیٹھا بچھونے کو غلاف اپنا ہے
کہیں سوں سوں کہیں سی سی ہے کہیں سیٹی ہے
گرد سب بیٹھے ہیں اور بیچ میں انگیٹھی ہے

مولانا آزاد ہی کی طرح حالی کی نظموں میں بھی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں حب الوطنی کے جذبات کا احساس ہوتا ہے جیسے ''برکھارت''، ''حب الوطن''، ''مناظر رحم و انصاف''، ''چپ کی داد''، ''مناجات بیوہ''، ''مرثیہ دہلی''، ''مرغی اور اس کے بچے''، ''بلی اور چوہا''، ''پیشے''، ''موچی اور سہیلی'' وغیرہ۔ ہندوستان میں موسم گرما بے حد تکلیف دہ اور جھلسانے والا ہوتا ہے۔ اپنی انتہا پر پہنچ کر یہ موسم برسات کے آثار نمایاں کرتا ہے۔ ''برکھارت'' میں حالی نے ہندوستان میں گرمی کے موسم کی اس انتہا اور برسات سے راحت اور خوشی کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ چند شعر دیکھیے۔

تھی لوٹ سی آ پڑی چمن میں
اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں
سنڈے تھے بلوں میں منہ چھپائے
اور ہانپ رہے تھے چار پائے

جاتا ہے کوئی ملار گاتا
ہے دیس میں کوئی گنگناتا
بھنگی ہیں نشے میں گاتے پھرتے
اور بانسریاں بجاتے پھرتے

جب وطن سے جدائی کے غم میں ان کا دل کسی چیز میں نہیں لگتا ہے تب لکھتے ہیں؛

تم سے کٹتا تھا رنج تنہائی
تم سے پاتا تھا دل شکیبائی
تیری ایک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

حالی صرف ملک سے ظاہری محبت ہی نہیں کرتے بلکہ اس کی ترقی کے لیے قوم کو اکساتے اور تعمیری کاموں کی طرف راغب بھی کرتے تا کہ وطن میں بھائی چارگی کے ساتھ ساتھ امن وامان کا دورہ بھی ہوسکے۔حالی کی ایک نظم مناجات بیوہ کے بارے میں عبادت بریلوی اپنی کتاب جدید شاعری میں لکھتے ہیں:

''حالی نے اپنی اس نظم میں جذبات کی جوتصویریں پیش کی ہیں ان میں بھی ہندوستانی رنگ بھرا ہے اور ساری نظم میں ایک ہندوستانی ماحول ملتا ہے۔''

(عبادت بریلوی جدید اردو شاعری ص۔99)

حالی نے اپنی نظموں میں بلا امتیاز مذہب وملّت، ملک وقوم کی خدمت اور تمام ہم وطنوں کو اتحاد و بھائی چارگی کا پیغام دیا۔جس سے حالی کی وطن پرستی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔نئی نظم کی تحریک سے بہت سے شعرا حالی اور مولانا آزاد کی طرح براہِ راست وابستہ نہیں تھے لیکن ان شعرا نے بھی نئی نظم کی روایت کو آگے بڑھانے کے لیے خون وجگر صرف کیا۔ایسے شعرا میں شبلی، اکبرالہ آبادی، اسماعیل میرٹھی، سرور جہاں آبادی، اقبال، جوش اور چکبست وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔جن میں وطن پرستی کا مادہ کوٹ کوٹ کے بھرا تھا مثالوں سے ہم آگے اس بات کی تصدیق کرسکیں گے۔

اکبر الہ آبادی کو اردو نظم کے ارتقا میں ایک انفرادی مقام حاصل ہے انہوں نے طنز ومزاح کے اسلوب کو نئے امکانات سے روشناس کرایا انہوں نے انگریزی نظموں کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔برق کلیسا اور جلوہ دربار دلی دوایسی نظمیں ہیں جن میں ان کا منفرد لب ولہجہ نمایاں ہے کیونکہ یہ انگریزی ملازمت میں تھے اس وجہ سے وہ کھل کر انگریزوں کے خلاف نہیں لکھ پائے لیکن ان کا دل اپنے وطن کے لوگوں کی خوشحالی چاہنے والا تھا۔وہ اعتراف بھی کرتے تھے کہ انگریزوں کے خلاف آواز بلند کر کے وہ اپنی عافیت خراب کرنا نہیں چاہتے۔قدامت پسند تھے،عورتوں کے لیے پردہ پسند کرتے تھے،مسلمانوں کے لیے تحریک آزادی سے دوری بنانے کو پسند کرتے تھے کیونکہ انہیں انگریزوں کی سیاسی چالوں کا اور طاقت کا علم تھا لیکن اس دور کے دوسرے شاعر جیسے اسماعیل میرٹھی طنز ومزاح سے پرے ہندوستانی رنگ کا ایک الگ انداز میں پیش کرتے نظر آئے۔وطنی شاعری کی حیثیت سے ان کا نام اہم ہے۔جب وہ بچوں کے لیے کچھ لکھتے تو ہر نظم میں کچھ نہ کچھ سبق بچوں کو دیتے اور حب الوطنی کی محبت ان کے دل کو بے چین کرتی تو ان کے دل سے وطن پرستی کے ایسے جذبات ابھرتے ہیں جو شعروں میں ڈھل کر نظم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔اردو نظم کے ارتقاء میں اسماعیل میرٹھی کی خدمات اہم اور قابل ذکر ہیں۔انہوں نے تصور اور تخیل میں موضوع تلاش کرنے کے بجائے روز مرّہ کی زندگی کے واقعات، حالات، زمانہ فطری مناظر، گھریلو اشیاء اور پالتو جانوروں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔اسماعیل میرٹھی کی حب الوطنی سے لبریز نظموں میں وطن سے محبت، انگریزوں سے وطن کی آزادی کی خواہش، قدرتی مناظر، ہندوستانی معاشرت اور حالات وغیرہ کا اظہار ہوتا ہے۔انہوں نے جو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا پیش کر دیا۔سرسید تحریک سے براہِ راست جڑنے کے بجائے انہوں نے اس سے اثر قبول کیا اور میرٹھ میں اسکول کالج اور ایک مدرسہ قائم کیا۔اردو قواعد کی ایک کتاب بھی لکھی جو آج بھی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔وطن پرستی کے جذبات کے تحت اسماعیل میرٹھی کے یہاں ہندوستان کے قدرتی مناظر طبعی، جغرافیائی حالات، معاشرتی حالات، توہم پرستی، حیوانات، چرند پرند، موسم، رسم ورواج، پھل اور پھول وغیرہ کا بھرپور عکس نظر آتا ہے۔انہوں نے کئی انگریزی نظموں کا بھی ترجمہ کیا ہے۔

انہوں نے اردو نظم میں ہئیت کے تجربے بھی کیے۔''تاروں بھری رات'' اور ''چڑیا کے بچے'' معرّیٰ نظمیں ہیں۔اردو نظم میں ان کی خدمات سے گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔اسماعیل میرٹھی کے ہم عصر شاعر سرور جہاں آبادی ہیں۔جو اپنی شاعری بالکل دلہن کی طرح سجاؤ سنوار دیتے ہیں۔ چاہے وہ وطن ہندوستان پر مبنی ان کی نظم ہی کیوں نہ ہو۔سرور جہاں آبادی کی نظمیں وطن کو ماں اور دیوی کی طرح بیان کرتی ہیں۔''وہ عروس حب وطن''، ''چشمہ وطن''، ''پھولوں کا کنج''، ''سرزمین وطن''، ''خاکِ وطن''، ''مادرِ وطن''، ''یادِ وطن''، ''حسرتِ وطن''، ''قومی نوحہ''، ''جلوہ اُمید''، ''بدنصیب بنگال''، ''ایک جلوہ وطن'' اور ''محبت قوم کا گیت'' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔سرور جہاں آبادی کے یہاں حب الوطن کے جذبات، ہندوستانی تہذیب وتمدن، دیوی دیوتاؤں کا ذکر، ہندو عقیدے اور ہندو کلچر کے اجزاء سب گھل مل گئے ہیں اور یہاں کی مٹی مناظر قدرت حسیناؤں کے خدوخال، پھولوں کی رنگت، شفق جھیل، چشمے، ندی، نالے سب ان کی نظموں میں حب الوطنی کے نغمے چھیڑتی ہیں۔گوپی چند نارنگ اپنی کتاب ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری میں سرور جہاں آبادی کی شاعری سے متعلق رقم طراز ہیں کہ:

"سرور کے یہاں حب الوطن کا جذبہ دریا کی ایک لہر بن کر سامنے آتا ہے''۔

(گوپی چند نارنگ، ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، انجمن ترقی ہند،2003ص۔340)

علامہ اقبال کو اردو کا سب سے بڑا نظم نگار کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔انھوں نے بھی نظم کی ہئیت میں بعض تجربے کیے۔ان کی بہت سی نظمیں قومی اور ملکی موضوعات پر ہیں جیسے ''ہمالیہ''، ''نیا شوالہ''، ''تصویر درد''، ''ترانہ ہندی'' اور ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت''، ''پرندے کی فریاد''، ''موجِ دریا''، ''رام''، ''نانک رام نانک'' اور ''تیرتھ'' وغیرہ خاص ہیں۔گوپی چند نارنگ کے مطابق اردو شاعری کو سیاسی انقلاب کا تصور اقبال نے ادا کیا۔

(گوپی چند نارنگ، ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، انجمن ترقی ہند،2003ص۔380)

عبادت بریلوی اپنی کتاب جدید شاعری کے مضمون اقبال میں کہتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ:

''اقبال کے فکر وطن میں اتنی گہرائی، اس قدر وسعت اور اس درجہ ہمہ گیری ہے کہ جسے سمجھنا کسی غیر متوازن اور جذباتی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔اس کے لیے فلسفی کے دماغ اور شاعر کے دل کے ساتھ ساتھ ایک انسانی شعور کی بھی ضرورت ہے۔''

(عبادت بریلوی جدید شاعری، اردو دنیا کراچی 1961ص۔183)

اقبال کی نظم ترانہ ہندی حب الوطنی اور قومی یکجہتی کا بہترین شاہکار ہیں آج تک یہ نظم اپنی پوری آب وتاب معنویت اور آفاقیت کے ساتھ نسل در نسل قائم ہے۔ایک شعر پیش خدمت ہے:

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

اپنی نظم ''رام'' میں اقبال نے جس عقیدت اور عظمت کا ثبوت دیا ہے وہ اپنے ہم وطن ہند بھائیوں کے مذہبی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔وہ لکھتے ہیں حیران کے وجود پہ ہندوستان کو ناز اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند اقبال کے زیر اثر چکبست اور جوش کی وطن پرست نظم برطانوی حکومت کے ظلم وجبر کی نہ صرف مذمت کرتی ہیں بلکہ اس کی خلافت بھی کرتی ہیں۔جوش کی نظم پیمانِ محکم میں جوش تو جوش کا غضب وغصہ بھی اجاگر ہوتا ہے۔

قسم ہے اس نبض کی جو ڈوبتی نبضیں ابھارے گا
کہ ہندوستان جیسے ہی تو مجھ کو پکارے گا
میری تبلیغ رواں باطل کے سر پر جگمگائے گی
تیرے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی نہ ہونے پائے گی

جوش کی اسی طرح کی دیگر نظموں میں ''آثار انقلاب''، ''لمحہ آزادی''، ''وطن''، ''شکست زندہ کا خواب''، ''مرد انقلاب کی آواز''، ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام'' اہم ہیں۔جوش اپنی نظم درآمیت میں

ہندو مسلم کو آپس میں لڑنے سے روکتے ہیں۔ وہ اس نظم میں کہتے ہیں آدمی کو پہلے انسان بننے کی ضرورت ہے بعد میں کچھ اور، آدمی کی آدمیت پر زور دیتے ہوئے وہ قومی یکجہتی کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ جوش کے ہم عصر شاعر چکبست نے بھی برطانوی حکومت کے خلاف ہندوستان کو ایک جٹ کرنے کے لیے کچھ نظمیں لکھیں۔ چکبست کی نظموں کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلی وہ جو مذہبی موضوعات پر ہیں، دوسری وہ جو سیاسی رہنماؤں سے متعلق ہیں اور تیسری وہ جو چکبست نے حب وطن کے موضوعات پر لکھیں۔ تیسری قسم کی نظموں میں 'حب قومی'، 'فریادِ قوم'، 'آوازِ قوم'، 'ہمارا وطن دل سے پیارا وطن'، 'وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک' اور 'وطن کا راگ' وغیرہ اہم ہیں۔ جن میں چکبست اور ان کی وطن پرستی سے وطن سے محبت عظمت اور عقیدت کے پرتو نمایاں ہیں۔

اقبال اور ان کے معاصرین کے بعد ترقی پسند تحریک کے مصنفین کا سب سے اہم موضوع وطن کی آزادی ہی تھا۔ پروفیسر عقیل احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''جیسے جیسے سیاست کا رخ بدلتا رہا شعری موضوعات میں بھی تبدیلی آتی رہی۔ جب حب الوطنی کا احساس بیدار کرنے والی شاعری سے وطن کی آزادی تک سب ہی موضوعات نظم کیے جانے لگے۔ بیسویں صدی کے ربع اول میں ایک اور رجحان نظموں میں در آیا جو صحافت کا تھا۔ اس رجحان کے تحت اہم سیاسی موضوعات اور ہنگامی واقعات و حادثات بھی شعری موضوع بننے لگے۔''

(عقیل احمد صدیقی جدید اردو نظم نظریہ و عمل مضمون ترقی پسند شعری موضوعات، ۱۹۹۰ء ص۔ 109)

اسرار الحق مجاز ایک ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام آہنگ کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ ''انقلاب''، ''طفلی کا خواب''، ''نذرِ دل نورا''، ''کسی سے محبت ہے''، ''ایک غمگین یاد''، ''آج رات''، ''اندھیری رات کا مسافر''، ''رات اور ریل''، ''آہنگ''، ''نوجوان سے نوجوان خاتون''، ''ہمارا جھنڈا''، ''ادھر بھی آ''، ''خواب سحر''، ''پہلا جشن آزادی''، ''نذر علی گڑھ''، ''آوارہ'' اور ''وطن آشوب'' وغیرہ ہر نظم میں مجاز کا جذبہ حب الوطنی امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ان نظموں سے وطن اور اس کے ذرے ذرے سے محبت کا علم ہوتا ہے۔ مجاز ہی کی طرح جاں نثار اختر کی خدمات رومان اور انقلاب کی بہترین مظہر ہیں۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:

رہے جگمگاتا یہ سنگم کا روپ
چمکتی کھنک چاندنی نرم دھوپ
جھلکتی رہے یہ اشوکا کی لاٹ
یہ گوکل کی گلیاں یہ کاشی کے گھاٹ

جاں نثار کی نظم آواز دو ہم ایک ہیں کا ایک بند یہاں ضرور پیش کروں گی۔

سنگم ہماری آن ہے
چتوڑ اپنی شان ہے
گل مرگ کا مہکا چمن
جمنا کا پٹ گوکل کا بن
گنگا کے دھارے اپنے ہیں
یہ سب ہمارے اپنے ہیں

جان نثار اختر ہی کی طرح علی سردار جعفری بھی ترقی پسند تحریک ہی کے شاعر تھے۔ ان کے شعری مجموعے'' لہو پکارتا ہے''، ''پتھر کی دیوار''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''ایشیا جاگ اٹھا'' اور ''خون کی لکیر'' بہت اہم ہیں۔ ان کی شاعری نے ہندوستانی عظیم تہذیب و تمدن اور قدیم روایات کو بیان کیا ہے۔

انہیں کے ہم عصر فیض احمد فیض، کیفی اعظمی اور مخدوم محی الدین قادری زور وغیرہ نے بھی نظموں میں ہندوستانی عوام کے دلوں میں حب الوطنی کو پوری شد و مد کے ساتھ جگانے کی کوشش کی ہے۔ المختصر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شعراء کی شاعری حب الوطنی کے انہی جذبات سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔

ترقی پسندوں کے بعد اب جب ملک میں آزادی کا دور آیا تو یہ اپنے ساتھ خوشی کے علاوہ تقسیم جیسے دردناک واقعے کے ساتھ اردو شاعری کے سامنے تھا۔ راہی معصوم رضا کی نظمیں ''پیاس و پانی''، ''وصیت''، ''شام اور شام''، ''نئے شنکر'' اسی دور کی یاد دہانی کرتی نظر آتی ہیں۔ یوں تو فسادات پر بہت سی نظمیں کہی گئی ہیں لیکن راہی معصوم رضا نے ''گنگا اور مہادیو'' میں اس مسئلے پر ذہنوں کو جھنجھوڑ ڈالا ہے۔

میرا نام مسلمانوں جیسا ہے
مجھ کو قتل کرو
اور میرے گھر میں آگ لگا دو
میرے اس کمرے کی عصمت لوٹو
میں جس میں تلسی کے رامائن سے
سرگوشی کر کے کالی داس کے میگھ دوت سے یہ کہتا ہوں
مجھ کو قتل کرو اور میرے گھر میں آگ لگا دو

اس طرح آزادی کے بعد بھی اردو نظمیں اپنی روایت کے مطابق حب الوطنی کے شعور کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتی رہیں۔ 20 اکتوبر 1962 میں چین سے لڑائی کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد اردو کے تقریباً ہر قابل ذکر شاعر نے چین اور ہندوستان کی لڑائی میں ہندوستان کو یکجہتی کے لیے پکارا۔ اس سلسلے میں وسیم بریلوی کی ''آندھی کا بہاؤ''، شمیم کرہانی کی ''میرے وطن اے میرے''، وطن علی جوار زیدی کی ''زخم جبیں'' کافی مقبول ہوئیں۔

یہ جنگ کانٹوں سے پھولوں کی جنگ ہے بیشک یہ جنگ اونچے اصولوں کی جنگ ہے
بے شک تم بھی میرے ساتھ آؤ

(سلام مچھلی شہری)

ہنگامی موضوعات کو اس طرح پیش کرنا کہ وہ یکجہتی کا شعور پیدا کرسکیں اردو شاعری کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ ساحر لدھیانوی کی نظم کا یہ بند دیکھیے:

ناپاک ارادوں نے بڑھ کر جس دیس کی دھرتی چھیڑی ہے
اس دیش کی دھرتی پر ہم نے نہرو کی خاک بکھیری ہے
اس راکھ کی عزت رکھنے کو ہو جائیں گے سب قربان
یہ جان لے پاکستان۔

جدید دور میں لکھنے والوں نے بھی حب الوطنی پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک لمبی فہرست ہے، جن میں کچھ اہم نام اس طرح ہیں اثر لکھنوی کی ''درس اتحاد''، جمیل مظہری کی ''بھارت ماتا''، آزاد سونی پتی کی ''قومی یکجہتی''، سیماب اکبر آبادی کی 'عید' پر لکھی گئی نظم علی عباس امید کی نظم ''ہندوستان ایک ہے'' اہم ہے۔ آج اردو نظم اپنا تاریخی کردار بھر پور ادا کرسکتی ہے۔ اگر تاریخ سے سبق لیا گیا اور ہندوستانی کلچر کی بنیادی روح یعنی رواداری باہمی احترام وسیع النظری، کثرت میں وحدت کے اصولوں پر قائم ہوئی تو چشم و تمنا آنے والے ہندوستان کو بہت خوشحال دیکھ سکتی ہے۔ جو اصلی ہندوستانی تہذیب کو سموئے ہوئے ہوگا جس میں سبھی مذہب و ملت کے لوگ خوشی خوشی اپنی زندگی جی سکیں گے۔

❑❑❑

غزل

کس کو پڑی تھی کون بجھاتا پرائی آگ
آنکھوں نے خود ہی قلب و جگر کی بجھائی آگ

سچ تو یہ ہے انہیں نے دلوں میں لگائی آگ
رکھتے ہیں مٹھیوں میں جو دست حنائی آگ

کس نے حسین آنکھوں میں بھردیں اداسیاں
کس نے ہتھیلیوں سے تمہاری چرائی آگ

چنگاریوں کے شور سے جنگل لرز اٹھا
دانستہ خار وخس میں یہ کس نے لگائی آگ

اس دل نے لو لگائی ہے کس گرم ناز سے
کیوں یہ نفس نفس میں ہماری سمائی آگ

آتا ہے اس کا ذکر تو ہنستے ہیں کھل کے لوگ
جو رکھتے جان بوجھ کے دل میں پرائی آگ

حالات کی تپش میں تجسؔ گھرے رہے
ماضی کے ریگ زار میں اکثر دبائی آگ

تجسسؔ اعجازی
مظہر عالم، ۷/۱۲۷/۲۹۷، شاہ گنج نخاس، لکھنؤ
8127207838

غزل

چڑھا کے چاک پہ جو چاہے وہ بنا مجھ کو
اے کوزہ گر نہ بنا وقت کا خدا مجھ کو

نہ آئی راس ترے حسن کی فضا مجھ کو
تمام عمر ملی عشق کی سزا مجھ کو

اصول عشق کی پابند تھی زباں میری
ہزار بار کہا تو نے بے وفا مجھ کو

فروغ دیتا ہے وہ دم بدم جنوں کو مرے
جہاں یہ دیتا نہیں ہوش کی دوا مجھ کو

کٹھن سفر میں یہ آسانیاں ہوئیں کیسے
شکستہ دل کوئی دیتا ہے کیا دعا مجھ کو

وہ پہلے گھونٹ کا اب بھی سرور ہے باقی
دمِ سحر مئے پُر زور مت پلا مجھ کو

بچا سکو تو بچالو تم اپنا سر کوثرؔ
جنونِ شوق میں ہر کرب ہے روا مجھ کو

کوثر پروین
کولکاتہ
9339784378

احمد صغیر
حنیف منزل، کوئلی پوکھر، پولیس لائن، گیول بیگھا، گیا، بہار
9931421834

بازار

> ''میں چلتے چلتے بہت دور نکل گیا۔ جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو شہر کا وہ بازار بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ اتنا پیچھے کہ نہ اب اس کا کوئی شور سنائی دے رہا تھا، نہ روشنی، نہ کوئی شخص............ اب میں روشنیوں کے سمندر میں آ گیا تھا۔ ہر طرف جگمگ کرتی روشنی، زرق برق لباس پہنے لوگ، فیشن ایبل کپڑے، گہنے، چہرے پر مسکان، ہونٹوں پر تبسم، رخساروں پر غازہ، تنگ کپڑے، میں جس دُکان............نہیں نہیں اسے دُکان نہیں کہہ سکتے یہ تو مال ہے۔ اس کے اندر ایک پوری دنیا آباد ہے۔ میں اندر جا کر اس دنیا کو دیکھنا چاہتا ہوں لیکن ہمت نہیں جٹا پا رہا ہوں۔ آخر اندر جا کر کیا خریدوں گا لیکن اندر کی دنیا مجھے بلا رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس دنیا میں جو ایک بار چلا جاتا ہے اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے پھر اسے دوسری دنیا اچھی ہی نہیں لگتی۔ بس یہاں کی اشیاء کا ہی وہ شیدائی ہو جاتا ہے''

ہاں یہ بازار ہے۔ شہر کا مشہور بازار۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز فروخت ہوتی ہے۔ سڑک کی دونوں جانب اپنے اپنے سامان سجائے دکان دار گاہکوں کو لبھانے کے لئے مختلف طرح کی بولیاں لگاتے ہیں۔ یہاں ہر وقت چہل پہل، گہما گہمی رہتی ہے۔ دکان داروں کو شاید ہی کوئی لمحہ فرصت نصیب ہوتی۔ ایک گاہک گیا نہیں کہ دوسرا کھڑا ہے۔ یہ اُس وقت کے حالات تھے جب ملک میں سب کچھ نارمل تھا لیکن کورونا وائرس کے چلتے لاک ڈاؤن کے بعد جب بازار کھلا تو سارا منظر بدل چکا تھا۔ ایک پھول والا چلّا رہا ہے—— ''لے لو پھول کا ہار لے لو............گلاب............چمیلی............بیلا............موگرا کے ہار لے لو............اپنی بیویوں کے جوڑے میں لگانے کے لیے ہار لے لو۔'' لیکن اس کی آواز سن کر نہ کوئی مرد رُکتا نہ کوئی عورت ٹھہرتی۔ البتہ کئی عورتیں ان کی طرف دیکھتیں ضرور، پھر آگے بڑھ جاتیں۔ کئی عورتیں اپنے جوڑوں تک ہاتھ لے جاتیں اور خواہش ہوتی کہ ہار لے کر جوڑے میں سجا لے لیکن فوراً ہی اپنا ارادہ بدل کر آگے بڑھ جاتیں۔ پھول والا اسی طرح آواز لگاتا رہتا—— ''لے لو پھولوں کا ہار لے لو............''

فٹ پاتھ پر چپل بیچنے والا دکان دار اپنے ہاتھ میں چپل لے کر گاہکوں کو اپنی جگہ کھڑا ہو کر آواز لگا رہا ہے—— ''مضبوط چپلیں............ہر رنگ اور کلر کی چپلیں ایک بار خرید لو اور سال بھر پہنتے رہو............جاڑا............گرمی............برسات............دے ہر موسم میں آپ کا ساتھ............''

لیکن چپل کی دکان پر بھی کوئی نہیں رک رہا تھا۔ اس دکان سے گزرنے والا شخص ایک بار اپنے پیر کی طرف ضرور دیکھتا۔ کوئی گھسی ہوئی چپل کو دیکھ کر سوچتا، نئی چپل خرید لیں لیکن جب ہاتھ جیب کے پاس جاتا تو آگے بڑھ جاتا۔ جیب میں اتنے روپے نہیں ہوتے کہ چپل خریدی جائے۔ اس روپے سے دوسری ضروری سامان خرید لوں گا۔ جب تک ساتھ دے رہی ہے نہیں بدلوں گا۔ جب بالکل ٹوٹ جائے گی تو دیکھا جائے گا۔ ایک ادھیڑ عورت اپنی پیوند لگی چپل کو دیکھتی ہے اور سوچتی ہے، نئی چپل خرید لیں۔ پیوند لگی چپل پہننے سے اس کی انگلی چھل گئی ہے لیکن یہ سوچ کر آگے بڑھ گئی کہ فی الحال چپل خریدنے کے لیے اس کے پاس روپے نہیں ہیں۔ کوئی اپنے بچے کو ننگے پیر ہی لے کر آگے نکل جاتا۔ اس کا بچہ حسرت سے چپل کی دکان کو دیکھتا رہتا بلکہ آگے بڑھنے کے بعد بھی پیچھے مڑ کر حسرت بھری نگاہوں سے چپل کو دیکھتا ہی جاتا۔ بوٹ پالش کرنے والا سڑک کے کنارے آتے جاتے لوگوں کو حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے—— ''بوٹ پالش............بوٹ پالش............آئیے بوٹ پالش کروا لیجیے............دس روپے میں بوٹ پالش۔''

جوتے پہنے ہوئے لوگوں کے قدم کچھ پل کے لیے بوٹ پالش کرنے والے موچی کے پاس رکتے ضرور لیکن دوسرے ہی لمحہ قدم آگے بڑھ جاتے۔ کچھ دور جانے کے بعد اپنے جوتے پر نگاہ ڈالتے جو کئی مہینوں سے پالش نہ ہونے کی وجہ سے بدرنگ ہو گئے تھے۔

ٹھیلے پر ریڈی میڈ کپڑے بیچنے والے ایک ساتھ چلّا رہے تھے—— ''سَو کی کُرتی............سَو کی شلوار............دوپٹہ فری............دو سوٹ پر ایک سوٹ مفت............آجاؤ بہنا............آجاؤ بھوجی............چاچی لے لو............یہ تم پر بہت جمے گا............باجی ایک سوٹ تو لیتی جاؤ............تین سو تو سلائی میں لگ جاتے ہیں............ہم دو سو میں سلا سلایا دے رہے ہیں............ہر رنگ............ہر ڈیزائن............ہر فیشن کا۔''

گزرتی عورتیں بنا اُدھر دیکھے ہی گزر جاتیں، البتہ لڑکیاں ایک نگاہ ہینگر میں ٹنگے سوٹ، کرتی اور شلوار کو ضرور دیکھتیں لیکن دکان کے قریب آ کر مول بھاؤ کرنے کی ہمت نہیں جٹا پاتیں۔ انہیں پتہ تھا دکان دار کے پاس جانے کا مطلب ہے کہ کسی بھی طرح خریدنے پر مجبور کر دے گا

اورلاک ڈاؤن نےگھر کا پورا بجٹ ہی بگاڑ دیا تھا۔ جب تک پرانے کپڑوں سے کام چلایا جاسکتا ہے۔ نیا خریدنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

سڑک کی نکڑ پر میک اپ کا سامان بیچنے والا الگ شور مچا رہا ہے ـــــ ’’کان کی بالی پچاس روپے............ناک کا بیسر بیس روپے............مانگ ٹیکہ سو روپے............ پائل سو روپے............کنگنا پچاس روپے............لپ اسٹک دس روپے............ نیل پالش دس روپے............لے لو باجی............لے لو بہنا۔ اتنا سستا کہیں نہ ملنا۔‘‘

لڑکیاں اس کی باتوں کو سن کر مسکرا ضرور دیتیں لیکن دکان کے قریب سے گزر جاتیں۔ ان کے پرس میں اتنے روپے نہیں تھے کہ کوئی بھی میک اپ کا سامان خرید سکتیں جو ان کے گھر پر پہلے سے تھا اس سے ہی کام چلا رہی تھیں یا پھر اچانک سے ان کے لیے یہ غیر ضروری چیز ہوگئی تھی۔

مزار سے ذرا ہٹ کر ایک گول گپے اور چاٹ کا ٹھیلہ لگتا تھا۔ جہاں پر عورتوں کا جم غفیر ہوتا تھا۔ بیس پچیس عورتیں اور لڑکیاں ہر وقت ٹھیلے کو گھیرے رہتیں۔ مرد کی تو اُس ٹھیلے تک رسائی ہی ممکن نہیں تھی۔ اس لیے اگر چاٹ کھانے کی خواہش بھی ہوتی تو اسے اندر ہی دبا لیتے یا پھر آگے کی ایک دوسری چاٹ کی دکان میں چلے جاتے جو اس ٹھیلے والے سے کافی مہنگا فروخت کرتا تھا لیکن لاک ڈاؤن کے بعد اس ٹھیلے پر کبھی کبھار ایک دو عورتیں ہی نظر آتیں۔ باقی وقت میں وہ گاہکوں کی راہ تکتا رہتا۔ اب لوگ فضول خرچی سے بچ رہے تھے۔ دو وقت کا کھانا مل جائے وہی غنیمت ہے۔ یہ چاٹ، گول گپے کھانے کے لیے عورتوں کے پاس پیسے نہیں تھے۔

ایک کیتلی میں بھر کر چائے بیچنے والا ہر دکان دار سے پوچھ رہا تھا۔ بھیا چائے دو دوں لیکن ہر دکان دار منع کر دیتا۔ جب کہ اس سے پہلے، دن میں کئی کئی بار یہی لوگ چائے پیتے تھے۔ جس سے اس کی اچھی آمدنی ہوجایا کرتی تھی۔

بازار کھلا ہے لیکن خریدار نہیں ہے۔ اشیاء موجود ہیں لیکن لینے والا ندارد ہے۔

(2)

میں چلتے چلتے بہت دور نکل گیا۔ جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو شہر کا وہ بازار بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ اتنا پیچھے کہ نہ اب اس کا کوئی شور سنائی دے رہا تھا، نہ روشنی، نہ کوئی شخص............ اب میں روشنیوں کے سمندر میں آگیا تھا۔ ہر طرف جگمگ کرتی روشنی، زرق برق لباس پہنے لوگ، فیشن ایبل کپڑے، گہنے، چہرے پر مسکان، ہونٹوں پر تبسم، رخساروں پر غازہ، تنگ کپڑے، میں جس دُکان............نہیں نہیں اسے دُکان نہیں کہہ سکتے یہ تو مال ہے۔ اس کے اندر ایک پوری دنیا آباد ہے۔ میں اندر جا کر اس دنیا کو دیکھنا چاہتا ہوں لیکن ہمت نہیں جٹا پا رہا ہوں۔ آخر اندر جا کر کیا خریدوں گا لیکن اندر کی دنیا مجھے بلا رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس دنیا میں جو ایک بار چلا جاتا ہے اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے پھر اسے دوسری دنیا اچھی ہی نہیں لگتی۔ بس یہاں کی اشیاء کا ہی وہ شیدائی ہو جاتا ہے اور اسی میں اپنی ضرورت کا ہر سامان تلاش کرتا ہے اور اُسے وہاں اس کی ضرورت کا ہر سامان مل جاتا ہے۔ اس بازار کا دُکاندار گاہکوں کو لبھانے کے لیے ضرورت کا ہر سامان مہیا کراتا ہے۔ اگر کوئی اس میں ایک بار داخل ہوگیا، خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹتا اس کے ہاتھ میں کئی کیری بیگ ہوں گے اور ہر کیری بیگ پر برانڈ کمپنی کا مہر ثبت ہوگا۔ جب کئی لوگ اپنے ہاتھوں میں کیری بیگ لے کر اس طلسمی دُنیا سے باہر آئے تو میں اپنے آپ کو روک نہیں پایا۔ ہمت کر کے اندر داخل ہوگیا۔ اندر روشنیوں کی برسات ہو رہی تھی۔ اتنی روشنی میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ رنگ برنگی روشنی، جگمگ کرتی روشنی، آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی، لوگوں کی بھیڑ تھی، ہر آدمی اپنی ضرورت کا سامان دیکھتا اور اسے ٹرالی میں رکھتا جاتا۔ جب ٹرالی بھر جاتی وہ کیش کاؤنٹر پر جاتا۔ اس کا بل ادا کرتا اور باہر نکل جاتا۔ میں حیرت بھری نگاہوں سے وہاں موجود سبھی سامانوں کو دیکھتا رہا۔ جو سامان پسند آتا۔ پہلے اس کی قیمت دیکھتا۔ ایک شرٹ پسند آئی۔ میں نے اسے اُٹھا کر دیکھا۔ اُسی وقت ایک سیلس مین میرے پاس آگیا ـــــ

’’سر کہیے تو اسی برانڈ کا اور شرٹ دکھاؤں۔‘‘

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ کورٹ پینٹ اور ٹائی لگائے وہ سیلس مین سے زیادہ کوئی افسر لگ رہا تھا۔

’’اس کی قیمت کیا ہے؟‘‘

’’صرف پانچ ہزار۔‘‘

میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ پانچ ہزار ایسے بول رہا تھا جیسے پانچ سو بول رہا ہو۔

’’سر اگر اس سے زیادہ قیمت والا شرٹ کہیے تو وہ بھی دکھا سکتا ہوں میرے پاس دس ہزار کے بھی شرٹ ہیں لیکن اس سے کم قیمت کی شرٹ میرے پاس نہیں ہے جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔‘‘

میں نے فوراً شرٹ اُس ہینگر میں ٹکا دیا جہاں سے نکالا تھا۔ وہ میری اوقات سمجھ گیا کہ میں پانچ سو روپیہ سے زیادہ کا شرٹ نہیں خرید سکتا۔ میں وہاں سے ہٹ گیا سیلس مین دوسرے گاہک سے بات کرنے لگا۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جیب میں موجود روپیہ کو گنا۔ صرف ایک ہزار روپے تھے ـــــ ’’اتنے میں تو شاید بنیان بھی نہیں آئے گی۔ برانڈیڈ بنیان کی بھی قیمت ایک ہزار سے کم نہ تھی۔‘‘ میں وہاں سے جلد نکل جانا چاہتا تھا لیکن وہاں کی چکا چوندھ روشنی مجھے نکلنے نہیں دے رہی تھی۔ میں مزید اشیاء کو دیکھنا چاہتا تھا اس کی قیمت جاننا چاہتا تھا لیکن قیمت جان کر کیا کروں گا جب خریدنا ہی نہیں ہے۔ لوگ آتے رہے، سامان خریدتے رہے اور جاتے رہے۔ میں وہیں کھڑا کبھی مال کو دیکھتا۔ اس کے اندر قرینے سے سجائے سامان کو، افسر جیسے سیلس مین اور پری جیسی سیلس گرل کو۔ آنے والے گاہکوں کو، جانے والی عورتوں کو۔ میری آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی تھیں لیکن میرے پیر منجمد ہو گئے تھے۔ جیسے زمین نے جکڑ لیا تھا۔ وہ چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ میں جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن وہاں کا ماحول اپنے سحر میں اس طرح لیے ہوئے تھا کہ میں چاہ کر بھی اس کے سحر سے نہیں نکل پا رہا تھا۔ تبھی ایک عورت مجھ سے ٹکرا گئی۔ میں لڑکھڑا گیا اور گرتے گرتے بچا ـــ ’’اوہ ساری‘‘ میرے منہ سے نکلا لیکن اس نے ناگواری سے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ جب کچھ خریدنا ہی نہیں ہے تو کیوں اتنے مہنگے مال میں چلے آتے ہیں۔

میں نے اس کی بات نہیں سنی لیکن وہ یہی کہہ رہی تھی۔ وہ میرے پاس سے گزر گئی۔ لیکن اس کی پرفیوم کی خوشبو ابھی تک میرے مشام کو معطر کر رہی تھی۔ میں اس خوشبو کا دیوانہ ہوگیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے جانا چاہتا تھا۔ اتنی دور تک جہاں تک اس کی خوشبو ملتی رہے لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بار پھر میں نے مال کے چاروں طرف نظر دوڑائی اور بے دلی سے باہر آگیا۔ باہر وہی لڑکی کھڑی کافی پی رہی تھی جو مجھ سے ٹکرائی تھی۔ ایک بار پھر اس کی خوشبو میری ناک سے ٹکرائی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی کافی کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا ـــــ ’’ایک کپ کافی۔‘‘ ـــــ میں نے آہستہ سے کہا۔ پتہ نہیں میری آواز اس کے کانوں تک گئی یا نہیں لیکن میں دوبارہ بولنا مناسب

نہیں سمجھا۔کافی پینے کی کوئی شدید خواہش نہیں تھی صرف اس لڑکی کی پر فیوم کی خوشبو مجھے وہاں تک لے آئی۔کافی والے نے کافی میری طرف بڑھایا۔میں ہاتھ میں لے کر ایک چسکی لی۔میں نے ایک بار پھر اس لڑکی کی طرف دیکھا۔وہ کافی کا کپ کاؤنٹر پر رکھ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔میں اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔جب میں نے کافی ختم کر کے کپ کاؤنٹر پر رکھا تو اس نے مجھ سے دو سو روپیہ مانگے،میں چونک پڑا۔ایک کپ کافی کی قیمت دوسو روپیہ۔باہر میں تو بیس روپے میں مل جاتی ہے۔میں نے خاموشی سے دوسو روپیہ دے دیا اور جلدی سے باہر آ گیا کہ اگر اسی طرح ایک دو سامان مزید کھالیا تو جیب میں جو ایک ہزار روپیہ ہے یہیں ختم ہو جائے گا۔

باہر آکر میں نے پلٹ کر ایک بار پھر مال کو دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

(3)

ابھی میں کچھ ہی دور گیا تھا کہ میرے موبائل کی گھنٹی بج اُٹھی۔میں نے جیب سے موبائل نکال کر اسکرین پر نام پڑھا،وکرم شاہ کا تھا۔وکرم شاہ میرے کالج کا دوست تھا۔میں ادب کا طالب علم تھا اور وہ مینجمنٹ کا۔مینجمنٹ کا کورس کر کے وہ ایک کمپنی کا مالک ہو گیا تھا۔اس کے والد بھی بڑے بزنس مین تھے۔میں نے کال ریسیو کیا۔وہ مجھے کہیں لے کر جانا چاہتا تھا۔اکثر و بیشتر وہ کسی میٹنگ کسی ڈیل یا دعوت میں مجھے لے کر جاتا۔حالانکہ مجھے بزنس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن جب وہ کوئی ڈیل کرتا تو مجھ سے مشورہ ضرور کرتا اور میں اُسے صحیح مشورہ دیتا۔آج بھی وہ کسی ڈیل کے لیے جا رہا تھا۔اس نے مجھے پیک اپ کیا اور میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

ہم لوگوں نے ایک بڑے ہوٹل میں قدم رکھا تو وہاں موجود لوگوں نے ہم لوگوں کا پر تپاک خیر مقدم کیا۔جب میٹنگ ہال میں پہنچے تو وہاں صرف دو تین لوگ تھے جبکہ اس سے قبل میں جب بھی کسی ڈیل کے لیے اس کے ساتھ گیا دس لوگ ضرور ہوتے کبھی کبھی تو بیس لوگ ہوتے۔ان تین لوگوں نے بڑھ کر ہم لوگوں کا سواگت کیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔بیرا کافی اور پانی رکھ کر چلا گیا۔وہاں موجود لوگوں نے مجھے حیرت سے دیکھا اور وکرم سے اشارے میں میرے بارے میں دریافت کیا۔وکرم نے بتایا کہ یہ میرا بزنس پارٹنر ہے۔تب اس نے کہنا شروع کیا——’’ہاں تو مسٹر وکرم شاہ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں اپنی پٹرولیم کمپنی فروخت کرنا چاہتا ہوں۔لیکن ڈیل دو طرح سے ہوگی ایک جائز طریقے سے اور ایک ناجائز طریقے سے۔قیمت کم سے کم لگائی جائے گی جسے آپ کو چیک کے ذریعہ دینے ہیں اور باقی کی رقم کیش میں دینی ہوگی جس کا کوئی لیکھا جوکھا نہیں ہوگا۔یہ بات چونکہ فون پر نہیں ہو سکتی تھی۔اس لیے آپ کو یہاں بلایا ہے۔‘‘

’’مجھے سودا منظور ہے۔‘‘ وکرم نے میری طرف دیکھا میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ضروری کارروائی کے بعد ہم لوگ باہر آ گئے۔میں نے وکرم کی طرف دیکھا۔اس نے بھی میری طرف دیکھا۔

’’تم شاید یہ جاننا چاہ رہے ہو کہ جو پٹرولیم کمپنی فائدے میں چل رہی تھی اسے کیوں فروخت کیا جا رہا ہے۔یہی سیاست ہے۔کمپنی گھاٹا دکھا کر کم قیمت میں بیچ دے گی اور جو باقی رقم ملے گی وہ سوئس بینک میں جمع کرا دیا جائے گا۔یہ بازار ہے میرے دوست۔ہر کے بزنس کرنے کا طریقہ الگ الگ ہے۔‘‘

وکرم مسکرا رہا تھا اور میں حیران تھا کہ یہ کیسا بازار ہے۔

❑❑❑

غزل

مُحفلِ شبستاں میں مُفلسی نچاتی ہے
سازِ دل شکستہ پر زندگی نچاتی ہے

مُفلسی کے آنگن میں بے بسی نچاتی ہے
زندگی کی چاہت میں زندگی نچاتی ہے

پاؤں تھک چکے میرے، نیند بھی نہیں آتی
دن تو ناچتے گزرا، رات بھی نچاتی ہے

گھومتا ہوں مُدّت سے صرف ایک محور پر
اِس طرح سیاست کی رہبری نچاتی ہے

گردشِ زمانہ سے کیا اُمید کی جائے
کل بھی وہ نچاتی تھی آج بھی نچاتی ہے

میں چلا تھا کعبے کو، دَیر تک چلا آیا
جستجوئے جاناں میں گُمرہی نچاتی ہے

بسترِ تفکّر پر جاگتا ہوں میں خورشیدؔ
اور رات بھر مُجھ کو شاعری نچاتی ہے

خورشید دلدار نگری
غازی پور
9918650734

حبیب کیفی

۲۷ لالہ لاجپت رائے کالونی، چوپاسنی روڈ عیدگاہ، جودھپور

8000245673

مبارک قدم

ذہن میں کئی طرح کے خیال آئے تھے۔کئی کئی قسم کے خاکے بھی بنے تھے۔شعیب نے ان خاکوں میں دل پسند رنگ بھی بھر ڈالے تھے۔تاہم اب تک بھی وہ یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ گفتگو کے آغاز کی صورت کیا رہے۔سلام ہی سہی، بولنا تو پہلے اسی کو ہے۔پھر اس کے بعد؟گفتگو کو آگے کیسے بڑھایا جائے گا؟شعیب کے سامنے یہ تمام باتیں عین فطری تھی کہ زندگی میں ایک ہی تو موقع ہوا کرتا ہے ایسا----شب عروس!

اور پھر شعیب کو زیادہ دیر تک سوچنا بھی نہیں پڑا۔گفتگو کے آغاز کی صورت جیسے از خود ہی بن گئی تھی۔اس کے یار غار اور ٹھیکیداری میں برابری کے حصے دار شاہد نے اس کی مشکل آسان کر ڈالی تھی۔ابھی وہ دولہے کے لباس میں ہی تھا کہ شاہد نے اسے مطلع کیا----موبائل پر میسج کے ذریعے پتہ چلا ہے کہ سڑک بنانے کا سرکاری ٹینڈر آج ہی اپنی کمپنی کے نام ہوا ہے۔سن کر مطمئن ہونے کے ساتھ ہی شعیب کو اس سے بڑی خوشی بھی ہوئی اور اس کو ایک نئی راہ مل گئی۔مہکے مہکے اور قرینے سے سجے ہوئے کمرے میں داخل ہونے کے بعد شعیب نے سب سے پہلے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا لی۔پلٹ کر دیکھا تو کچھ قدم کے فاصلے پر ہی آراستہ اور کشادہ پلنگ کے قریب اس نے حنا کو پایا۔سرخ جوڑے میں وہ وہاں سر جھکائے ہوئے کھڑی تھی۔دوپٹے کے جھینے گھونگھٹ سے اس کا چہرہ بڑی حد تک دیکھنے میں آرہا تھا۔قریب جا کر شعیب نے سلام کہا تو نویلی دلہن نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے دھیمی لیکن صاف آواز میں جواب دیا،وعلیکم سلام۔آگے اب اس سے کیا کہنا ہے،یہ بھی اس کے ذہن میں تھا۔تاہم وہ کچھ پل ٹھہر گیا۔اصل میں حنا کی آواز کے سحر نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔قدم تمہارے بہت مبارک ہیں! کہنے کے ساتھ ہی حنا کو اس نے شانوں سے تھام کر بڑی آہستگی کے ساتھ پلنگ پر بٹھا دیا۔

پوچھو گی نہیں کہ تمہارے قدموں کو میں نے مبارک کیوں کہا" قریب ہی خاموش اور سر جھکائے بیٹھی حنا کی جانب دیکھتے ہوئے شعیب نے کہا۔جی۔۔۔۔حنا نے لب ہلائے۔سڑک بنانے کے سرکاری ٹینڈر کے آج ہی اپنی کمپنی کے حق میں پاس ہو جانے کی اطلاع دینے کے بعد اس نے مزید کہا" یہی وجہ رہی کہ میں نے تمہارے قدموں کو مبارک کہا۔جی،شکریہ۔اس نے اسی انداز میں کہا۔اور اس مبارک قدم کی۔۔۔۔صورت بھی ابھی تک دیکھ لینا نصیب نہ ہو سکا ہے مجھے!" ہلکے سے مسکراتے ہوئے شعیب نے گویا شکوہ کیا۔جواب میں حنا نے اس کی طرف دیکھا۔اس نے کیا دیکھا،یہ اہم نہیں تھا۔پر شعیب نے جو دیکھا وہ اس کے لیے بہت ہی اہم تھا۔صاف شفاف سرخی مائل گورا چہرہ،تازہ سیب ایسے رخسار،ستواں ناک میں دمکتی ہوئی نتھ،مخمور بڑی بڑی آنکھیں،کشادہ پیشانی،گہری گھنیری زلفوں کی بنی دراز چوٹی،صراحی ایسی گردن اور اس کے پورے وجود سے اُٹھتی ہوئی پرکشش قدرتی مہک۔اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا وہاں۔خاموش وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا تو حنا اس کی جانب متوجہ ہوئی۔ادھر شعیب کی طرف کیا ہو چلا ہے حنا کو اس بات کا احساس تھا کہ خود اسے بھی اپنے حسین ہونے کا بخوبی علم تھا۔اسے اس بات کا بھی گمان تھا کہ کیوں اس نے مزید اب تک کچھ نہیں کہا ہے۔تاہم وہ لاعلم سی بنی ہوئی اپنے مقام پر خاموش بیٹھی رہی۔سر اس کا اب بھی جھکا جھکا ہی تھا۔ادھر شعیب کی کیفیت بالکل وہی تھی۔۔۔۔تجھ کو دیکھیں کہ تجھ سے بات کریں؟لیکن کیا بات کی جائے اس وقت؟وہ یہ بھولا ہوا تھا۔اصل میں وہ حنا کے حسن کے سحر میں گرفتار ہو چلا تھا اور پھر اس کے بعد شب عروس ہی جیسے ملتفت ہو چلی تھی۔

سننے میں آیا تو ہے،کئی سہیلیوں نے راز دارانہ لہجے میں بتایا بھی تھا کہ شب عروس میں ایسا ہی کچھ ہوا کرتا ہے۔تعریفوں کے پل باندھے جاتے ہیں۔زمین آسمان کے قلابے ملا دیے جاتے ہیں۔مبارک قدم اور اسی سے مشابہت رکھنے والے جملے کہے جاتے ہیں۔یہ سب متاثر کر کے بس میں کر لینے کے بہانے ہوا کرتے ہیں۔

"یورپ کے اس کامیاب ٹور سے دونوں ہی میاں بیوی ہنسی خوشی اپنے شہر لوٹ آئے تو یکسوئی کے عالم میں ایک روز حنا نے خاوند کو خوشخبری دیتے ہوئے کہا کہ وہ باپ بننے والا ہے۔شعیب نے جب یہ سنا تو وہ جیسے نہال ہی ہو اٹھا تھا۔ بیوی پر اس نے اسی دم اپنی بھرپور محبت لٹا ڈالنے کے بعد فرط مسرت اور جوش ہی جوش میں وہ کہہ بیٹھا۔ہم اس کا نام نوید رکھیں گے۔نوید یعنی خوشخبری۔مبارک قدم!لیکن کیا ضروری ہے کہ ہمارے ہاں بیٹا ہی ہوگا؟ مسکراتے ہوئے حنا نے شعیب کی جانب دیکھا۔"بیٹی بھی تو ہو سکتی ہے۔" نہیں۔یہ میرا حکم ہے کہ پہلے بیٹا ہو اور پھر اس کے بعد بیٹی۔" کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔پھر اس کے بعد کچھ ہی مہینوں میں شعیب کی دلی آرزو پوری بھی ہوگئی۔امید کے مطابق ہی حنا نے چاند ایسے ایک بیٹے کو جنم دیا،جس کا نام اس کی پیدائش سے پہلے ہی رکھ دیا گیا تھا۔۔۔۔نوید! نوید کے آجانے سے حنا ہاؤس کی رونق دوبالا ہو چلی تھی۔"

اگلے روز ولیمے کی شب بھی حنا نے خود کے لیے جب مبارک قدم ہونے کی بات سنی تو وہ متعجب ہوئی. اسے خیال گزرا کہ گئی شب مہر ادائیگی کے بعد سب کچھ بنیادی اور ضروری ہو چلا ہے اور سارا کچھ توقعات کے مطابق ہی ہوتا گیا ہے تو پھر آج اس مبارک قدم کا کیا محل رہا؟ لیکن اپنے اس سوال کے جواب کے لیے اسے زیادہ دیر منتظر بھی نہیں رہنا پڑا. اس نے جانا کہ سڑک بنانے کے سرکاری آرڈر کی کاپی بھی کمپنی کو باقاعدہ مل گئی ہے۔ پھر اس کے بعد کچھ دن کے لیے کمپنی کا سارا ہی کام پارٹنر دوست شاہد کے بھروسے چھوڑ کر شعیب گرمی کے ان دنوں میں حنا کے ہمراہ پہاڑوں کی رانی کے لیے روانہ ہو گیا۔ اصل میں یہ ان دونوں کے ہنی مون کا ٹور رہا۔ اپنے شہر سے روانہ ہو کر کوئی ہفتہ بھر بعد اس ٹھنڈی ٹھنڈی جگہ سے لوٹ آنے سے پہلے تک دونوں ہی میاں بیوی جیسے کسی اور ہی دنیا میں رہنے لگے تھے۔ ہنسی خوشی اور مستی کے ساتھ۔ کل ملا کر ان کا یہ ٹور اس لحاظ سے کامیاب رہا۔

حنا کے ہاتھ کی حنا ابھی پوری طرح سے چھوٹی بھی نہیں تھی کہ شعیب نے بیوی کو ایک روز اچانک ہی سرپرائز دے ڈالا۔ ناشتے کے بعد ابھی وہ کچن کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ بازار سے لوٹ آئے شعیب نے اسے اپنی باہوں میں بھر کر فرش سے کافی اوپر اٹھا لیا۔ فرط مسرت سے اس دم اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ کچھ اچھا سنو گی؟ وہ اسی عالم میں اس سے مخاطب تھا۔ اللہ؟ آپ پہلے زمین پر تو پیر ٹکا لینے دیجیے۔" وہ بولی. لو سنبھالو انہیں...." بیوی کے پاؤں فرش پر ٹکے تو چابیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے شعیب نے کہا. یہ تو کار کی چابیاں ہیں.... حنا بولی۔ ہنڈریڈ پرسنٹ! اس نے کہا۔ اور کار باہر کھڑی ہے.... مبارک قدم. ہم کار والے ہو گئے!

اللہ اس وقت تو چھوڑیے!... اس کے فوراً بعد دونوں ہی میاں بیوی اپنے فلیٹ کے باہر تھے۔ بہت خوب! حنا نے کار کو دیکھتے ہوئے کہا۔" کلر بھی اس کا آنکھوں کو بھلا لگتا ہے. تمہیں پسند ہے؟ بہت۔ دو پل ٹھہرنے کے بعد اس نے کہا." لیکن اسے ہم رکھیں گے کہاں؟ جگہ تو بہت ہی مختصر ہے اپنے پاس. دیکھتے ہیں کہ کیا صورت بنتی ہے۔ شعیب نے کہا. اس طرح ان دونوں کی زندگی ہنسی خوشی گزر رہی تھی خوشیاں ان دونوں کے پاس گویا دوڑی چلی آ رہی تھیں۔ مالی اعتبار سے وہ دونوں ہی بے فکر تھے۔ ایس اینڈ ایس (شعیب اور شاہد) کنسٹرکشن کمپنی کے دوڑے چلے جانے کے سبب اس مال و دولت میں متواتر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہی بڑی وجہ رہی کہ گھر میں آسائشوں کے سامان میں بھی اسی رفتار سے اضافہ ہوتا چلا گیا۔ انہی حالات کے مدنظر شعیب کو کئی بار خیال گزرتا کہ جنت جسے کہتے ہیں، وہ شاید اس کے گھر ایسی ہی ہوتی ہوگی۔ اسی جنت کو اور زیادہ حسین بنا ڈالنے کا موقع بھی جلدی ہی آ گیا۔

وہ جو اس روز تم نے پوچھا تھا کہ گاڑی ہم کہاں رکھیں گے.. شعیب نے حنا کو مخاطب کر کے کہا۔

جی۔ حنا اسی کو دیکھ رہی تھی۔ سب کام چھوڑ چھاڑ کر تم اسی دم میرے ساتھ چلو. شعیب نے اس سے کہا. اللہ خیر! کہاں چلنے کے لیے کہہ رہے ہیں آپ؟ تم اٹھو تو.... اس نے اصرار کیا. اور سرپٹ دوڑتی ہوئی کار کوئی آدھا گھنٹے کے سفر کے بعد پوش کالونی کے ایک بنگلے کے آگے آ کر رکی تو حنا نے خاوند کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ تم آؤ تو میرے ساتھ۔۔۔۔

اور وہ دونوں ہی کار سے اتر کر آہنی پھاٹک کھولنے کے بعد اندر داخل ہوئے۔ حنا اس وقت تک بھی متعجب تھی۔۔۔۔ کیا یہ بنگلہ شعیب نے کرائے پر لے لیا ہے یا۔۔۔۔؟ نگاہ اٹھا کر ذرا اوپر تو دیکھو. بیوی کو خود سے لگاتے ہوئے شعیب نے کہا۔ مبارک قدم!

حنا نے سر اونچا کر کے دیکھا۔ وہاں جلی حروف میں جیسے دمک رہا تھا حنا ہاؤس.

اس طرح پوش کالونی میں ان کی یہاں ایک شاندار رہائش گاہ بھی ہو گئی۔

تمہارے آنے کے بعد سے زندگی میں کس قدر خوشگوار تبدیلیاں ہو چلی ہیں بیگم!.... کھانے کے بعد شعیب نے ایک شب فرصت کے وقت بیوی کو مخاطب کر کے کہا۔

اللہ کا کرم ہے۔ حنا نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ آپ کی محنتوں کا نتیجہ ہے۔

پر قدم تو تمہارے ہی مبارک رہے نا۔ اس نے کہا۔ سنو کہ مصروفیات تو دنوں دن بڑھتی ہی جائیں گی اور کار جہاں دراز ہوتا جائے گا. اس اثناء میں ایک ضروری کام کر لیا جانا چاہیے۔

جی؟ سوالیہ نگاہوں سے اس نے اسے دیکھا کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ اس نے مزید کہا. سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں. کچھ سمجھی نہیں میں۔ حنا نے لب ہلائے. سمجھنے کی بات صرف اتنی سی ہے کہ سیر کو جی چاہنے لگا ہے. یورپ گھومنے کا ارادہ ہو رہا ہے. اس نے بتایا. خاوند سے خوشی خوشی متفق ہونے کے سبب ان دونوں کا یہ ٹور ممکن بھی ہو گیا. آناً فاناً میں پاسپورٹ بننے کے بعد ویزا بھی مل گیا تو کمپنی کا کام ایک بار پھر دوست اور پارٹنر شاہد کے بھروسے چھوڑ کر حنا کے ہمراہ وہ یورپ کے لیے نکل پڑا۔

یورپ کو اب تک ان دونوں نے کتابوں میں ہی پڑھا تھا یا پھر فلموں اور ٹیلی ویژن پر دیکھا تھا۔ لیکن اپنے وجود کو یورپ کی سرد اور خوشگوار فضاؤں میں پایا تو ان دونوں کی طبیعت باغ باغ اور سیر ہو گئی۔ تواریخی مقامات کے علاوہ دور حاضرہ کی جدید ترین ٹیکنالوجی اور ترقی کو دیکھ کر حیرت کے ساتھ ہی ساتھ انہیں خوشی بھی ہوئی وہاں کی زندگی میں نظم و ضبط کو دیکھ کر بھی ان دونوں کو بہت اچھا لگا تھا۔ وہاں مال و دولت کی فراوانی نے بھی ان دونوں کو متاثر کیا تھا۔

یورپ کے اس کامیاب ٹور سے دونوں ہی میاں بیوی ہنسی خوشی اپنے شہر لوٹ آئے تو یکسوئی کے عالم میں ایک روز حنا نے خاوند کو خوشخبری دیتے ہوئے کہا کہ وہ باپ بننے والا ہے۔

شعیب نے جب یہ سنا تو وہ جیسے نہال ہی ہو اٹھا تھا۔ بیوی پر اس نے اسی دم اپنی بھرپور محبت لٹا ڈالنے کے بعد فرط مسرت اور جوش ہی جوش میں وہ کہہ بیٹھا۔ ہم اس کا نام نوید رکھیں گے. نوید یعنی خوشخبری۔ مبارک قدم! لیکن کیا ضروری ہے کہ ہمارے ہاں بیٹا ہی ہوگا؟ مسکراتے ہوئے حنا نے شعیب کی جانب دیکھا۔" بیٹی بھی تو ہو سکتی ہے." نہیں. یہ میرا حکم ہے کہ پہلے بیٹا ہو اور پھر اس کے بعد بیٹی." کہہ کر وہ ہنسنے لگا. پھر اس کے بعد کچھ ہی مہینوں میں شعیب کی دلی آرزو پوری بھی ہو گئی۔ امید کے مطابق ہی حنا نے چاند ایسے ایک بیٹے کو جنم دیا، جس کا نام اس کی پیدائش سے پہلے ہی رکھ دیا گیا تھا۔۔۔ نوید! نوید کے آ جانے سے حنا ہاؤس کی رونق دوبالا ہو چلی تھی. دعوتوں اور پارٹیوں کا دور یہاں کئی کئی دنوں تک چلتا رہا تھا. حنا ہاؤس اس طرح شعیب کے لیے جنت نشان بن گیا. سکون اطمینان اور ہر طرح کے آرام کی جگہ۔ نوید کی ادھر بڑے نازوں کے ساتھ پرورش ہونے لگی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ بڑا بھی ہونے لگا۔ اپنی عمر کے چار برس وہ پار کرنے کو ہوا تو اسے اب ایک شاندار اور مہنگے اسکول میں داخل کرا ڈالنے کے متعلق سوچا جانے لگا۔

انہی دنوں کمپنی کے نام ایک بڑا ٹینڈر پاس ہوا تو شعیب مبارک قدم بیوی حنا کو سب سے پہلے اس کی اطلاع دے دینا چاہ رہا تھا۔ موقع دیکھ کر اس نے اسے بانہوں میں بھر کر فرش سے اٹھایا اور کان کے پاس منہ لے جا کر خوشخبری دینا چاہی تو ننھا نوید اسی دم ادھر نکل آیا۔ ان دونوں کو اس نے اس طرح دیکھا تو چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے تالیاں بجاتا ہوا وہ کہہ اٹھا۔۔۔

اچھا تو چھاہد انکل بھی کرتے ہیں امی سے!

❑❑❑

ہاشمی رضوی
کاظمین روڈ منصور نگر لکھنؤ
9792361988

ترقیات

پانچ کروڑ ضرورت مند سماجی بہبود کی اسکیموں سے فیضیاب

یوگی حکومت ریاست کے ہر طبقے بشمول غریبوں، محروموں، خواتین اور بزرگوں کی مدد کے لیے مختلف اسکیمیں چلا رہی ہے۔ ان اسکیموں کا فائدہ ریاست بھر میں بغیر کسی تفریق کے سبھی کو دیا جا رہا ہے۔ یوگی حکومت سب کا ساتھ سب کا وکاس کے تحت کام کر رہی ہے۔ پچھلے چھ سالوں کے اعداد و شمار پر نظر ڈالیں تو تقریباً پانچ کروڑ ضرورت مندوں نے محکمہ سماجی بہبود کی مختلف اسکیموں کا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے لیے یوگی حکومت نے پچھلے چھ سالوں میں 40 ہزار کروڑ روپے سے زیادہ خرچ کیے ہیں، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ ہمیشہ ریاست کے لوگوں کی مدد کے لیے کھڑے ہیں۔

سماجی بہبود کے ڈائریکٹر کمار پرشانت نے کہا کہ وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کی منشا کے مطابق، آخری پائیدان پر کھڑے شخص کو بھی اسکیموں کا فائدہ پہنچانے کے لیے مسلسل مہم چلائی جا رہی ہے۔ مہم کے ذریعے محکمہ کی 11 مختلف اسکیموں کو فائدہ پہنچایا جا رہا ہے۔ اس کے تحت گزشتہ چھ سال 2018/19 سے 23/24 کے درمیان 82738864 ضرورت مند مستحقین کو فوائد دیئے گئے۔ اس کے لیے یوگی حکومت نے 40667 کروڑ روپے خرچ کیے تھے۔ انہوں نے کہا کہ محکمہ کی نیشنل اولڈ ایج پنشن اسکیم کے تحت ہر ماہ بزرگوں کو پنشن دی جاتی ہے۔ اسکیم کے تحت پچھلے چھ سالوں میں 36257918 مستفیدین میں 2509730 لاکھ روپے کی رقم تقسیم کی گئی۔

اسی طرح نیشنل فیملی بینیفٹ اسکیم کے تحت خط افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والے خاندان کے سربراہ کو 30000 روپے کی یکمشت مالی امداد فراہم کی جاتی ہے۔ اس کے تحت 677755 خاندانوں کو 203326 لاکھ روپے کی مالی امداد فراہم کی گئی۔ چھ سالوں میں 367652 جوڑوں کی شادیاں ہوئیں ڈائرکٹر کمار پرشانت نے کہا کہ سی ایم یوگی کی ہدایت پر اسکیموں کا فائدہ ہر ضرورت مند کو اسکریننگ کر کے پہنچایا جا رہا ہے۔ چیف منسٹر گروپ میرج اسکیم کے تحت محکمہ مختلف برادریوں اور مذاہب کے رسم و رواج کے مطابق شادی کے پروگرام منعقد کرتا ہے۔ اسکیم کے تحت 367652 جوڑوں کی شادیاں کی گئیں۔ اس کے لیے یوگی حکومت نے 184030 لاکھ روپے خرچ کیے ہیں۔ اس کے علاوہ اسکالرشپ اور فیس ری ایمبرسمنٹ اسکیم کے تحت شیڈول کاسٹ اور جنرل کیٹیگری کے طلبہ کو اسکالرشپ دی جاتی ہے۔ قبل دہم اسکالرشپ تقسیم اسکیم کے تحت درج فہرست ذات کے 1985389 طلباء کو 47308 لاکھ روپے کی اسکالرشپ اور جنرل زمرہ کے 638669 طلباء میں 17202 لاکھ روپے تقسیم کیے گئے۔ اسی طرح پوسٹ ڈیتھ اسکالرشپ اور فیس ری ایمبرسمنٹ اسکیم کے تحت 484405 لاکھ روپے کی اسکالرشپ 5196409 درج فہرست ذات کے طلباء کو تقسیم کی گئی اور 343088 لاکھ روپے 3060875 عام زمرے کے طلباء میں تقسیم کیے گئے۔ ساتھ ہی، مالی امداد اسکیم کے تحت مظالم کے شکار درج فہرست ذات کے لوگوں کو مدد فراہم کی جاتی ہے۔ اسکیم کے تحت 135030 خاندانوں کو 129568 لاکھ روپے کی امداد فراہم کی گئی۔ اتنا ہی نہیں یوگی حکومت کی طرف سے پری ایگزام ٹریننگ سینٹر چلائے جا رہے ہیں۔ اس کے تحت 5103 طلباء نے اسکیم کا فائدہ اٹھایا۔ اس کے لیے 2913 لاکھ روپے خرچ ہوئے۔

51608 طلباء نے مکھیہ منتری ابھیودیا یوجنا کا فائدہ اٹھایا محکمہ کی طرف سے ریاست بھر میں شیڈول کاسٹ ہاسٹل چلائے جا رہے ہیں۔ گزشتہ چھ سالوں میں 53862 طلباء اس سے مستفید ہوئے ہیں۔ اس کے لیے 18670 لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ریاست بھر میں جئے پرکاش نارائن سروودیا ودیالیہ (پہلے نام راجکیا آشرم ودیالیہ) چلایا جا رہا ہے۔ پچھلے چھ سالوں میں 201693 مستفیدین نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ یوگی حکومت نے اس پر 18670 لاکھ روپے خرچ کیے ہیں۔ جبکہ گزشتہ چار سالوں میں 51608 مستفیدین نے چیف منسٹر ابھیودیا یوجنا کا فائدہ اٹھایا۔ اس کے لیے یوگی حکومت نے 4666 لاکھ روپے خرچ کیے ہیں، جبکہ اتر پردیش میں والدین اور بزرگ شہریوں کی دیکھ بھال اور اولڈ ایج ہوم چلائے جا رہے ہیں۔ ایک سال میں 6864 افراد اس کا فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ اس کے لیے 6193 لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں۔

❑❑❑

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ (انتر راشٹریہ جن جاتیہ بھاگیداری اتسو) پروگرام میں شرکت کرتے ہوئے۔

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ بے روزگاروں کو تقرری نامہ سونپتے ہوئے۔

वर्ष : 78 अंक 4
अगस्त, 2023
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

उर्दू मासिक, **नया दौर**
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

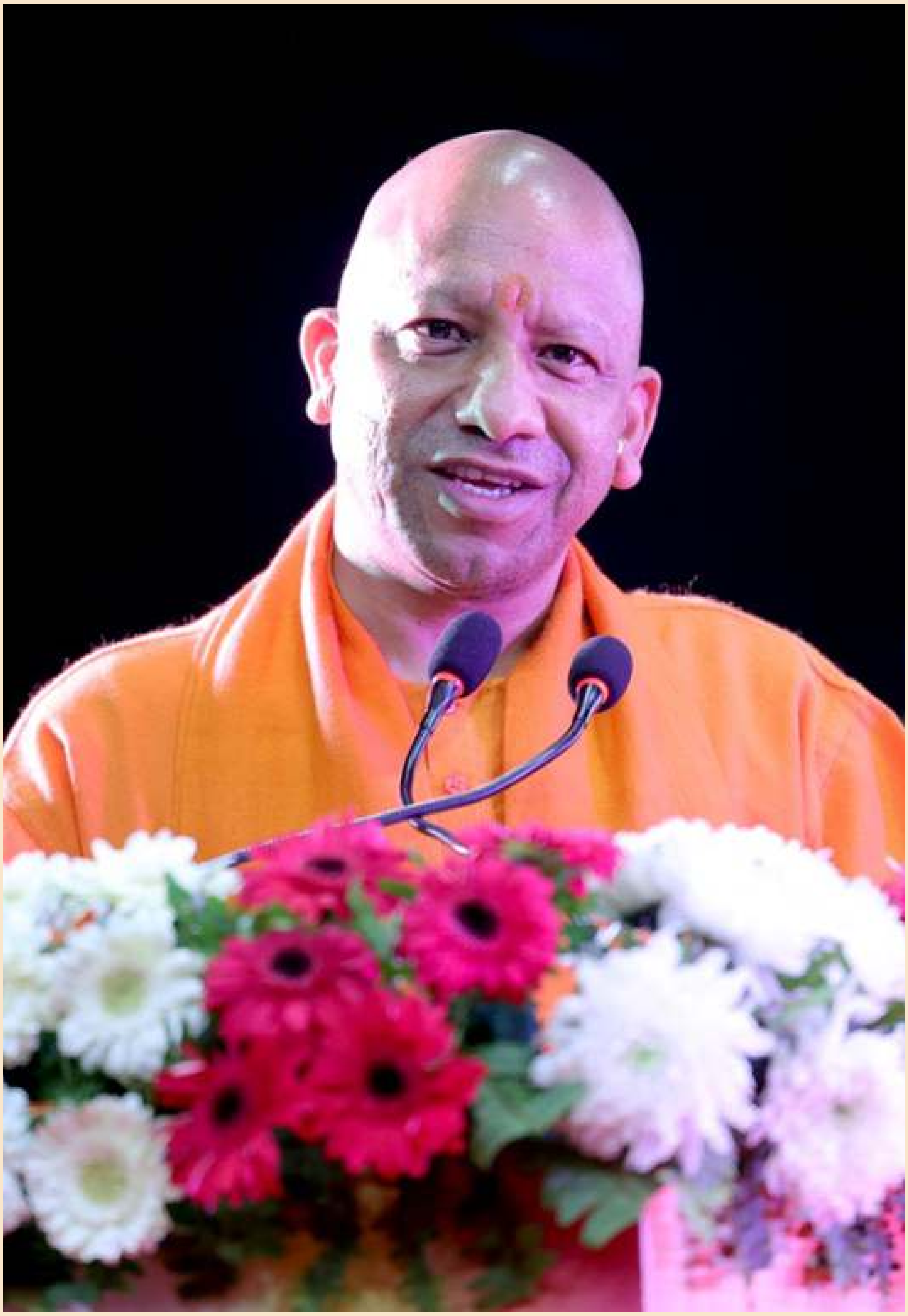

सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. स्वत्वाधिकारी के लिए शिशिर, निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. लखनऊ द्वारा प्रकाशित तथा प्रकाश एन. भार्गव, प्रकाश पैकेजर्स, प्रथम तल, शगुन पैलेस, 3–सप्रू मार्ग, लखनऊ द्वारा मुद्रित, सम्पादक– **रेहान अब्बास**